نظارے

نظارے

مرحوم کرشن چندر ایم اے

ناشر:- چرنجیت لال برائے دیپک پبلشرز۔ جالندھر

بار اوّل - جون ۱۹۶۴ء

قیمت:- پانچ روپے

باہتمام شری منوہر لال دُوا مالک موہن پریس سرکلر روڈ جالندھر
سے چھپ کر دیپک پبلشرز جالندھر سے شائع ہوئی

نظارے

کرشن چندر

کرشن چندر
دیپک پبلشرز

دیپک پبلشرز
جالندھر

فہرست

جنت اور جہنم ۷

بے رنگ بو ۲۷

آنسوؤں والی ۴۱

بچپن ۵۲

گل فروش ۷۳

دو فرلانگ لمبی سڑک ۹۱

بند والی ۱۰۳

ویکسی نیٹر ۱۱۹

خونی ناچ ۱۳۷

دل کا چراغ ۱۴۷

تلاش ۱۶۳

سفید پھول ۱۷۳

منگلیک ۱۹۱

جنّت اور جہنّم

جنت اور جہنم

زینی کے متعلق میں کیا جانتا ہوں، یہ تو میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا
انسان کی ذہنی کیفیتیں سمندر کے مد و جزر کی طرح دل کے ساحل پر آتی ہیں۔ اور اکثر نہایت ہی لطیف، ناپائیدار اور مبہم نقوش چھوڑ جاتی ہیں۔ اور عموماً یہ مبہم سی تصاویر لہروں کے دوسرے ریلے ہی میں فنا ہو جاتی ہیں کہ پھر ان کا نام و نشان بھی نہیں پا سکتا۔ یا پھر نئے نقوش اپنی تزئینِ نو اور حسنِ امتزاج سے نئی جمالیاتی کیفیتیں پیدا کر دیتے ہیں۔ اور ان کے آغوش میں اس ساحل کی ریت کا ہر ذرہ گنگنا اٹھتا ہے۔ "کیا اس سے پہلے بھی زندگی تھی۔ یا یہ نغمۂ حیات کی ایک اضطراری لے ہے؟"

لیکن بعض نقوش اس قدر ناپائیدار اور مبہم نہیں ہوتے۔ اور وہ ساحلِ حیات پر ایسی تصویریں کھینچ دیتے ہیں جو مدت تک قائم رہتی ہیں۔ ایسی ہی

تصویروں میں سے ایک تصویر زینی کی بھی ہے۔ اور دراصل ایک ہی نہیں بلکہ تین، کیونکہ جب کبھی مجھے زینی کا خیال آتا ہے تو بیک وقت اُس کی تین تصاویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں، تین مختلف تصاویر، تین مختلف لمحے، نگاہ کے تین مختلف زاویے جس طرح سات رنگوں سے مل کر قوسِ قزح بنتی ہے اسی طرح اِن تین تصاویر کی ترتیب سے زینی کی زندگی کی کہانی بن جاتی ہے۔ لیکن یہ زندگی قوسِ قزح سے بہت مختلف ہے، بہت مختلف!

دیکھنے میں تو زینی قوسِ قزح کی طرح ہی حسین تھی۔ میں نے جب پہلے پہل اُسے دیکھا تو اُس وقت میں سات پلوں والے شہر کے سب سے خوبصورت پُل امیرالدل پہ جھکا ہوا جہلم کی سطح پہ تیرتی ہوئی دُنیا کا جائزہ لے رہا تھا۔ یوں ہی بے کار سا، آوارہ سا، اُکتایا ہوا، سرینگر کی دلچسپیوں کو ایک بے کیف سطحی انداز سے دیکھ رہا تھا۔ شکاروں کے لال لال پھولوں سے کڑھے ہوئے پردے ایک طرف کو ہٹے ہوئے تھے۔ اور اُن میں کہیں موٹے موٹے مردوں کے ساتھ پری وش عورتیں سوار تھیں۔ جن کے چہرے اور جن کے طلائی آویزے دوپہر کی دُھوپ میں یکساں طور پر چمک رہے تھے۔ کہیں تنومند، وجیہہ نوجوانوں کے ہمراہ بھاری اور بدشکل عورتیں اپنے بہترین لباس پہنے بیٹھی تھیں۔ اور اپنی خوش قسمتی پر نازاں معلوم ہوتی تھیں۔ جو عورت جتنی زیادہ بدصورت تھی وُہ اُتنا ہی اچھا اور بھڑکیلا لباس پہنے تھی۔ دراصل پردے کی رسم تو اِن ہی عورتوں کے لئے رائج کی گئی تھی۔ اُن کے شوہروں کے چہرے کم از کم اِس وقت تو اسی خیال کے آئینہ دار تھے۔

بیچارے دُوسرے شکاروں میں بیٹھی ہُوئی خوبصورت عورتوں کو گھور گھور کر اپنے نقصان کی تلافی کرنا چاہتے تھے۔ اور اُن کی اپنی بیویاں نہایت دلفریب، میٹھی آواز میں ہنس ہنس کر اُنہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوششیں کر رہی تھیں۔ کم از کم مجھے اُن کی آواز بہت شیریں معلوم ہُوئی۔ شیریں جیسے کوئل کی کُوک اور کوئل کا رنگ بھی تو سیاہ ہی ہوتا ہے۔

شکارے خوبصورت اور بدصُورت مخلوق سے لدے ہُوئے تھے۔ لیکن ان میں زندگی کی حرکت، بے چینی، اضطراب سب کچھ مَوجُود تھا۔ وُہ پانی کی سطح پر بھاگتے ہُوئے جا رہے تھے۔ لال لال پردے ہلتے ہُوئے دکھائی دیتے بھدی شکلیں، حسین تصویروں میں تبدیل ہو جاتیں قہقہے اور ہانجیوں کے گیت ایک ہی نغمہ بن جاتے۔ اور وُہ شکارے دربار ہال کے سامنے اُسکے سفید سفید ستونوں کے قریب پہنچکر شہر وینس کا سا نظارہ پیش کرتے ہُوئے یک لخت موڑ پر غائب ہو جاتے۔ لیکن بے حرکت، بے زندگی، اِن لمبے لمبے دوم درجے کے ٹھونگوں یا ہوس بوٹوں میں زندگی جو پانی کی سطح پر چُپ چاپ بدنما بطخوں کی طرح تیر رہے تھے۔ اُن کی کھڑکیاں بند تھیں۔ لیکن پردے آویزاں تھے۔ صرف ایک ہاؤس بوٹ میں ایک کھڑکی کھُلی تھی۔ کھڑکی کے دونوں طرف دو انگریز عورتیں بیٹھی ہُوئی سویٹر بُن رہی تھیں۔ کیا یہ لوگ سرینگر میں سویٹر بُننے کے لئے آتے ہیں یا میری طرح پُل کے جنگلے کے قریب کھڑے ہو کر محض تماشہ دیکھنے کے لئے؟

اور پھر مجھے اس وقت زینی دکھائی دی۔ جہلم کے پانی کا ایک ہی ریلا اُسے

میرے دل کے ساحل کے قریب کھینچ لایا۔ وہ ایک چھوٹے سے ڈونگے کے کنارے پر کھڑی کشتی کا رُخ بدل رہی تھی۔ رُخ بدلنے کا چپّو اس کے ہاتھ میں تھا۔ اور چاندی کا ایک "جھمکا" اس کے کان میں کسی خاموش نغمے کی گت پر لہرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ پھر جیسے وہ بجلی کی تیزی کی طرح پُل کے نیچے سے گزر گئی۔ اور مجھے ڈونگے کا دوسرا سرا نظر آیا۔ یہاں ایک لمبی سی ڈانڈ لئے ایک گیارہ بارہ سال کا لڑکا ڈونگے کو کھے رہا تھا۔ اس کا گول، سرخ و سپید چہرہ اور سر پر گول منقش ٹوپی بھی پُل کے نیچے غائب ہو گئی۔ اور جب میں نے مڑ کر دیکھا۔ تو وہ پُل کی دوسری جانب آ چکے تھے۔ وہ ڈونگے کو نچلے گھاٹ پر لگانے کے لئے رُخ بدل رہے تھے۔ ڈونگے کی سب کھڑکیاں کھلی تھیں اور ان کھڑکیوں کے زرد زرد پردے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ میں نے کن پٹیوں پر ہاتھ کا سایہ کرتے ہوئے ڈونگے کا نام پڑھا۔ جو دھوپ میں چمکتے ہوئے نیلم کے ٹکڑے کی طرح درخشاں نظر آ رہا تھا۔

"THE HEAVEN" "جنّت"! یہ نام غالباً کسی عیش پسند سیاح یا کسی انگریز پادری نے رکھا ہو گا۔ جنّت اب نچلے گھاٹ کے قریب آ رہی تھی۔ اس کے ڈرائنگ روم کی بڑی کھڑکی کے اوپر ایک چوکور بورڈ لٹک رہا تھا۔ "TO LET" جنّت کرائے کے لئے خالی تھی۔ میں جنگل سے ہٹ کر ایک دو منٹ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ زینی اور چھوٹا لڑکا اب اسے کنارے پر باندھ رہے تھے۔ معاً میرے دل میں ایک خیال آیا۔ اور میں تیزی سے امیرا کدل کے پُل سے گزرتا ہوا نچلے گھاٹ کی سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔

زینی نے مجھے دیکھتے ہی سر جھکا کر سلام کیا۔ پھر وہ ڈانڈ کا سہارا لیے ایک عجیب جھجک اور بے عیب بے باکی کے ساتھ کشتی کے کنارے پر کھڑی ہوگئی اور چھوٹے لڑکے سے بولی ۔" عزیزا، صاحب کو ہوس بوٹ دکھاؤ۔"

عزیزا ہنستا ہوا اُٹھا۔ وہ یونہی ہنس رہا تھا۔ بغیر کسی وجہ کے، کشمیری لڑکوں کی طرح۔ اسکے دانت جو ٹوتھ پیسٹ کے استعمال کے بغیر ہی غیر معمولی طور پر سفید تھے اُس کے سُرخ ہونٹوں کے درمیان موتیوں کی لڑی کی طرح چمک رہے تھے۔ اُس نے ٹوپی اپنے سر سے اُتار کر بے پروائی سے زینی کے قدموں میں پھینک دی۔ اور پھر زینی نے جس ملائمت اور ملاطفت آمیز نگاہوں سے اسے دیکھا ہے۔ اُسے کچھ میں ہی بہتر جانتا ہوں۔ اُس کی آنکھیں عزیزا کی اِس معصوم شوخی پر ایک دم اِس طرح چمک اُٹھیں جیسے سحر کے وقت ڈل کے خاموش نیلے پانی پر آفتاب طلوع ہو جائے۔ اور جب میں عزیزا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ تو زینی کی تصویر آنکھوں کے سامنے ہی تھی۔

عزیزا کہنے لگا۔" یہ ڈرائینگ روم ہے! یہ اِس طرف آئینہ والا میز ہے۔ یہ لکھنے کا میز۔"

اور میں نے عزیزا سے پوچھا۔ "کیا یہ ہوس بوٹ تمہارا ہے اور وہ لڑکی کون ہے؟" "وہ؟ عزیزا نے یونہی سر ہلاتے اور مسکراتے ہوئے کہا۔" وہ زینی ہے۔ میری خالہ۔ یہ ہوس بوٹ زینی کے خاوند کا ہے۔ وہ نوکری کی تلاش میں سوپور گیا ہے۔ یہ اِس الماری میں چینی کے برتن، وہ سیٹ، چمچے، پرچیں، یہ کھانے کے برتن، وہ گیس لیمپ۔"

"اچھا، اچھا، آگے چلو۔"

یہ سونے کا کمرہ ہے، وہ دوسرا کمرہ بھی سونے کا ہے۔ اِن میں پانچ پلنگ آ سکتے ہیں۔ مَیں اور زینی اِس کمرے میں رہتے ہیں۔ وہ چھوٹا سا کمرہ۔ جو کچن کے قریب ڈونگے کی دُوسری طرف ہے۔

"اچھا چلو کچن دکھاؤ۔"

سب کچھ دیکھ لیا، اِس چھوٹے سے دوم دارجے کے ڈونگے کو جسے زینی اور عزیزا فخریہ لہجہ میں اپنا ہوس بوٹ کہتے تھے۔ زینی اور عزیزا کے ہونے والے "صاحب" نے، جسے پنجاب میں اِس کے سب دوست اِس کے بے ڈھنگے پن کی وجہ سے "لگڑ بگڑ یا چرخ" کہتے تھے۔ سب کچھ دیکھ لیا۔ لیکن زینی کو بار بار دیکھ کر بھی اِس کے دِل کی پیاس نہ بجھی۔

"زینی!" مَیں نے اپنی پتلون پر سے مٹی کا ایک خیالی ذرہ اُڑاتے ہوئے پُوچھا۔ "اِس ———— زینی، اِس ڈونگے کا، میرا مطلب ہے، اِس ہوس بوٹ کا کرایہ کیا ہوگا؟"

زینی نے اپنی باریک آواز میں کہا: "کیا صاحب یہیں رہے گا؟"

"ہاں، ہاں، اِسی بوٹ میں۔"

"تب یہ کرائے کے لئے خالی نہیں۔"

"ارے ––" میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔ "وہ کیوں؟"

عزیزا ہنستے ہُوئے بولا: "صاحب، ہمیں وُلر جانا ہے۔ دراصل ہمیں سوپور جانا ہے۔ مگر راستے میں وُلر آئے گی جھیل وُلر۔ اور مانس بل، ہم بڈڈ لگا

لیکن سوپور جائیں گے جہاں زینی کا گھر والا گیا ہے۔ پھر ہم اس کو لے کر واپس آئیں گے۔ اگر صاحب کو وُلر دیکھنا ہے تو منظور، ہم سب کچھ دکھائیں گے اور کرایہ بھی تھوڑا ہوگا۔ اگر صاحب کو اِدھر رہنا ہے، تو پھر ہم مجبور ہیں۔"

میں تھوڑی دیر کھڑا سوچتا رہا۔ عزیزا کا ہنستا ہوا معصوم سا چہرہ بہت پُر امید تھا۔ گویا وہ ملتجیانہ انداز میں کہہ رہا تھا، "چلو صاحب! وُلر دیکھنے، چلو صاحب۔" میں نے زینی کی طرف دیکھا۔ زینی کا چہرہ آنچل کی اوٹ میں تھا۔ کیا وہ بھی خاوند سے ملنے کے لئے بیقرار تھی؟ اور تُو --- اے شاعر مزاج آوارہ سیّاح! تو اِس خطرناک مثلث کو کیوں پورا کرنا چاہتا ہے؟ ہوس کے غلام؟ کیا تیرے لئے اس دُنیا میں کوئی اور کام نہیں؟ کوئی آرزو۔ کوئی مطمحِ نظر نہیں؟

لیکن دِل کے ساحل پہ اِس قسم کی لہریں بہت ہی چھوٹی چھوٹی۔ ہلکی اور لطیف ہوتی ہیں۔ آئیں اور چلی گئیں۔ اور ساحل کی ریت اپنے چمکتے ہوئے لاکھوں ذروں کے ساتھ بدستور کسی محبوب کی منتظر رہتی ہے!

میں نے آہستہ سے کہا۔ "اچھا، عزیزا آج شام کو تُم اِس ہوس بوٹ کو امیرا کدل کے سامنے ــــ اِس گھاٹ پر لے آنا۔ کل ہم وُلر چلیں گے۔"

"بہت اچھا صاحب۔" عزیزا نے پُر مسرت لہجہ میں کہا۔

زینی کا چہرہ بدستور آنچل کی اوٹ میں تھا۔

ــــ (۲) ــــ

ہری سنگھ ہائی سٹریٹ کی طرف جاتے ہوئے (جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا) راستہ

پھر انسانی زندگی کی حماقتوں پر غور کرتا رہا۔ حسن کیا ہے؟ اور انسان بدصورتی سے بھی زیادہ حسن سے کیوں متاثر ہوتا ہے؟ حسین پھول جب مرجھا جاتا ہے تو اسے آپ پاؤں تلے کیوں روند دیتے ہیں؟ اور کیوں ایک عورت پانچ بچے جننے کے بعد آپ کی تعریفی نگاہوں کی مستحق نہیں رہتی؟ یہ کیونکر ہوتا ہے۔ کہ ایک تنومند کسان دن بھر ایمانداری اور صدق دلی سے کام کرتا ہے۔ اور دن بھر خدا کو یاد کرتا ہوا بھی اپنے بال بچوں کے لئے نان و نفقہ مہیا نہیں کر سکتا۔ اور دوسری طرف وہ لوگ بھی ہیں جو اپنے گناہوں اور اوباشیوں کا بارِ گراں لئے ہوئے میدانوں کی تپتی ہوئی فضاؤں کو چھوڑ اس دلفریب وادی میں جنت کے مزے لوٹنے کے لئے آجاتے ہیں۔ اور پھر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ جن لوگوں نے اس دنیا میں غریب کی جنت ہتیالی وہ اگلی دنیا میں بھی اس کی جنت نہیں چھین لیں گے؟ تقدیر؟ تناسخ؟ رضا؟ اور پھر یہ تو زندگی کی حماقتیں ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ سوچا ہی کیوں جائے؟ کیا یہی کافی نہیں کہ زینی حسین ہے۔ اور اس کا خاوند سوپور گیا ہوا ہے۔ اور کل ہم اس کے ڈونگے پر سوار ہو کر ڈل دیکھنے جا رہے ہیں؟

جب میں اپنی قیام گاہ پر پہنچا تو سبھی میری رائے سے متفق نظر آتے تھے۔ گوربخش اپنی داڑھی کو کلپ لگاتے ہوئے بولا۔ "میں بھی چلوں گا۔" بھیا لال بولا۔ "میرے خیال میں آٹھ دس روز تو گزر ہی جائیں گے۔ آخر اب یہاں سرینگر میں رکھا ہی کیا ہے۔ کیوں سرفراز؟

بیگ نے اثبات میں سر ہلایا۔

محمود بولا۔ "کیوں بھئی میں بھی چلوں؟"

اب وہ گئے اندر اور مثلی۔ وہ دونوں بند کی طرف سیر کو گئے ہوئے تھے۔ جب واپس آئے تو اُنہوں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ کشمیر آکر زندگی کی حماقتوں پر غور کرنا بنفسہ سب سے بڑی حماقت ہے اور اس کا ازالہ صرف ایک ہی صورت میں ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ بھی وُلر کی سیر میں باقی احباب کا ساتھ دیں۔

گور بخش نے کہا۔ "آج رات ہم ڈونگے ہی میں بسر کریں گے۔ سارا اسباب لے چلو۔ ہارمونیم۔ طبلہ۔ گراموفون۔ کیمرہ۔ دوربین۔ بستر۔ مٹھائی۔ انڈے کیک۔ پھل اور ہاں میں بھول گیا تھا۔ تم لوگ اپنے لئے حجامت کا سامان بھی لیتے چلو۔ اور ہاں بھئی سرفراز، تم وہاں سے اس کمبخت ڈونگے والے ہی کو بلا لاتے۔ اسی سے یہ سامان اٹھوا کر لے جانے کو کہتے۔"

"کوئی کم بخت آدمی اس ڈونگے کا مالک والک نہیں ہے۔ بلکہ اس کی مالک تو ایک لڑکی ہے۔"

"لڑکی؟" سب نے یکایک چیخ کر کہا۔

"برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن!"

لیکن اُنہوں نے مجھے شعر پورا نہ کرنے دیا۔ دوسرا مصرعہ زبان سے ادا ہونے سے پہلے ہی وہ مجھ پر وحشیوں کی طرح پل پڑے۔ "ابے گاؤدی! ابے لگڑ بگڑ با چرخ۔" "اس کا نام کیا ہے؟" "شکل کیسی ہے؟" "بچہ جی

بتاتے ہو یا اپنا گلا دبواؤ گے؟"

"ہمیں سرینگر سے چلے ہوئے سات روز ہو چکے تھے۔ اور اب ہم اس دریائی زندگی سے بہت مانوس ہو چکے تھے۔ دن رات کھانا پکانے اور کھانا کھانے کے سوائے اور کیا کام ہو سکتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی برج کھیلے اور کبھی کیرم۔ ڈونگا اپنی دھیمی چال سے جہلم کی سطح پر بہتا رہا تھا۔ محمود اکثر دوربین لگائے اُن دور دراز اور بلند سلسلہ ہائے کوہ کی طرف دیکھتا رہتا۔ جن کی چوٹیاں گرمیوں میں بھی برف پوش دکھائی دیتی ہیں۔ گوربخش ہارمونیم کے پردوں پر ہاتھ رکھے اپنے گلے سے سُریلی تانیں نکالتا۔ اور بھیا لال اپنے دُبلے پتلے جسم اور لمبے قد کے ساتھ بار بار ڈونگے کی چھت کو ہاتھ لگا کر ہم کوتاہ قدوں کی تضحیک کرکے اپنی بدنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کرتا ـــــ اور زینی؟ لیکن زینی کے تو ہم سب پرستار تھے۔ گو میں اپنا خو سب پر فائق سمجھتا تھا۔ اور یہ بات میں نے اپنے ساتھیوں پر اچھی طرح واضح کر دی تھی۔ لیکن جلد ہی ہر ایک کو معلوم ہو گیا کہ یہ چڑیا کسی کے جال میں پھنسنے والی نہیں۔ اُس کی ادائیں دِل رُبا تھیں۔ اُس کے گیت دِلکش، اُس کی مسکراہٹ دِل افروز۔ لیکن اُسے اپنے خاوند سے محبت تھی۔ اُسے اپنے خاوند پر ناز تھا۔ جو سوپور میں تلاشِ معاش میں مصروف تھا۔ جب وہ چپّو چلاتے چلاتے یکایک ہنس پڑتی۔ تو یہ ہنسی ہم میں سے کسی کے لئے نہ ہوتی۔ عزیزا کے لئے بھی نہیں۔ جو اُسے اِتنا

بیارا تھا، پھر کبھی چپّو ہاتھ سے چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو کر انگڑائی لیتی۔ اور پھر مغرب کی طرف دیکھنے لگ جاتی جدھر سب پُور تھا۔ اُس وقت گور بخش ایک بے سُرے لہجے میں چِلّا اُٹھتا۔ "دلدار کمنداں والے دا ۔۔۔ دلدار!"

بھیّا لال نے تو پہلے دِن ہی زینی کو دیکھتے ہی کہہ دیا تھا۔ "گو شکل و صورت سے تو میں روایتی مجنوں ہوں۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ لیلےٰ مجھے محبّت کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتی۔ اور اِس لیلےٰ پر ہی کیا موقوف ہے، دُنیا کی کسی لیلےٰ کو بھی میری چاہ نہیں ہو سکتی۔ اِس لئے اے میری پہاڑی لیلےٰ! گڈ بائی۔" لیکن بھیّا لال ہی پر کیا منحصر ہے۔ قریباً قریباً یہی حال ہر ایک کا تھا۔ شروع شروع میں گور بخش نے زینی کو ایک دو دِن سُریلے عِشقیہ گیت سُنائے تھے، اور کچن میں بیٹھ کر مچھلیاں بھُونتے بھُونتے اِسے مچھلیوں کی ایک پلیٹ بھی پیش کی تھی۔ اور کبھی کبھی اِندر اور مَنّی جیبوں کے ڈِبوں میں سے سیب اور ناشپاتیاں چُرا کر اِسے دے دیا کرتے تھے۔ اور ہاں کبھی کبھی کیک کے ٹکڑے بھی۔ لیکن اب چند روز سے یہ فیاضی بند کر دی گئی تھی۔ اور اب سب لوگ زینی کو قریباً بھُول گئے تھے۔ اب وُہ دِن رات کھانا پکانا، گانا ناچنا، جہلم میں تیرنا اور اِسی قسم کے کاموں میں منہمک رہتے تھے۔ ہر ایک چہرہ بشاش نظر آتا تھا۔ اور اِس سات روز کے قلیل عرصے ہی میں ہر ایک کو یہ محسُوس ہونے لگا تھا کہ اِس کا وزن پہلے سے دُوگنا ہو گیا ہے۔

بھیّا لال نے اپنی پتلی کمر کا جائزہ لیتے ہُوئے کہا۔ "ارے یار اِدھر

تو سچ مچ موٹا ہو رہا ہوں۔ اب یہ پتلون مجھے کمر کے گرد تنگ معلوم ہوتی ہے۔"
اِندر نے اپنے پچکے ہوئے گالوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "مجھے بھی ایسا
ہی لگتا ہے کہ اب میرے گال پہلے جیسے پچکے ہوئے نہیں رہے۔"
محمود جو اشتراکی خیالات رکھتا تھا۔ طنزیہ لہجہ میں بولا۔ "ہاں۔ اِنقلاب
قریب آ رہا ہے۔"

. . . .

انقلاب تو خیر ایک دور از کار بات تھی۔ لیکن اِس میں شک نہیں تھا کہ سوپور
ضرور قریب آ رہا تھا۔ کل وُلر اور پرسوں سوپور۔ اور پھر شاید زینی کی یہ
شوخ ادائیں ہمیں عمر بھر میسر نہ آ سکیں گی۔ میں کچن کے دروازے پر کھڑا
ہو کر زینی کی طرف دیکھنے لگا۔ جو ڈونگے کے کنارے پر بیٹھی ہوئی چپّو
سے کشتی کا رُخ ٹھیک کر رہی تھی۔ ڈونگے کے دوسرے سرے پر کہیں عزیزا
پسینے میں تر بتر ڈانڈ چلا رہا ہوگا۔ میں نے دِل میں سوچا۔ بیچارہ غریب گیارہ
سال کا لڑکا۔ لیکن پیٹ کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ کچن کے عقب میں
جو کمرہ تھا وہاں محمود سویا پڑا تھا۔ اور اِس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز
میرے کانوں میں پہنچ رہی تھی۔ کبھی کبھی ڈرائینگ روم سے ہنسی کی ایک بلند چیخ
سُنائی دیتی تھی۔ اِندر نے برج کھیلتے وقت بلف سے کام لیا تھا۔

زینی نے کہا "صاحب، کل ہم وُلر پہنچ جائیں گے۔"

"جھیل وُلر کیا بہت خوبصورت ہے؟"

زینی مسکراتے ہوئے بولی، جی صاحب جدھر نظر اُٹھاؤ پانی ہی پانی، تیرہ چودہ میل
تک، چاروں طرف نیلا پانی اور بیچ بیچ میں کہیں کہیں کنول کے لاکھوں پھول کھلے

ہوئے اور سری بٹ ناگ ......"

"سری بٹ ناگ کیا؟"

بٹ ناگ وُلر کا دیوتا ہے۔ وُلر کا بادشاہ ہے۔ وہاں ہر ایک سیّاح کو چاہے وُہ ہندو ہو یا مسلمان یا انگریز، کچھ نذر دینی پڑتی ہے۔"

"اور اگر وُہ نہ دے؟"

"تو اس کی کشتی ڈوب جاتی ہے۔"

"اچھا..... تو کیا جھیل وُلر بہت خوبصورت ہو گی؟"

"صاحب خود دیکھ لیں گے۔"

"تم سے بھی زیادہ خوبصورت؟" مَیں نے زینی کے قریب جا کر کہا۔ زینی کا چہرہ جو پہلے (ایک سیب کے پھول کی طرح تھا اب ایک گلاب کا پھول بن گیا۔) اُس نے شرما کر اپنا منہ موڑ لیا۔

مَیں نے اپنی جیب سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکالا۔ اور زینی کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور جذبات سے گلوگیر آواز میں کہا۔ "یہ لو۔ اسے سری بٹ ناگ کی نذر کر دینا۔"

چند لمحے خاموش رہی۔ پھر یک لخت زینی چپّو چھوڑ کر، تن کر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے میری طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔ گلاب کا پھول ایک شعلہ بن گیا تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ میں کانپتے ہوئے نوٹ کو زور سے اپنی مُٹھی میں مسل ڈالا۔ اور پھر اسے تیزی سے پانی میں پھینک دیا۔ زینی کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اُس کی آنکھیں نم آلود ہو گئی تھیں اور

بالوں کی ایک لٹ دو اپنے رُخسار پر اُتر آئی تھی۔
یہ زینی کی دُوسری تصویر ہے۔ جو آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ مَیں آج بھی آنکھیں بند کرکے چشمِ تصوّر سے اُسے ایک شعلۂ جوالہ کی طرح بھڑک اُٹھتے دیکھ سکتا ہُوں۔
میں دیر تک کچن کے دروازے کے قریب کھڑا رہا۔ مجُوب اور پشیمان۔ اپنی شکست کی زندہ تصویر۔ نوٹ جو کہ ٹکڑے ہوا پانی کی سطح پر بہہ رہا تھا۔ آخر اِسے ایک مچھلی نے نگل لیا۔ آہستہ آہستہ آسمان کے مغربی حصّہ میں شفق کی لال گوں لہریں غائب ہوگئیں۔ اور رات کی سیاہ چادر پر تاروں کی افشاں چُن دی گئی۔ اِن تاروں کی شوخ ہنسی گویا مجھ سے بار بار کہہ رہی تھی۔ کیوں، کیا تم زینی کو بھی ایک مچھلی سمجھتے تھے۔ وُہ مچھلی جو تمہارے پانچ روپے کے نوٹ کو ایک نعمتِ مترقبہ سمجھ کر چُپ چاپ نگل جاتی۔ لیکن وُہ پانی کی مچھلی نہیں آدم کی اولاد ہے۔ اُسے اپنے بھلے بُرے کی تمیز ہے۔ وُہ غریب ہے، تو کیا ہُوا۔ وُہ تمہارے روپوں کی محتاج نہیں۔ تم اُسے نہیں خرید سکتے، کبھی نہیں خرید سکتے!"
دُوسرے دِن ہم وُلر کے کنارے پہنچ گئے۔ اور ہم نے اپنے ڈونگے کو وہاں بندھوایا جہاں دریائے جہلم جھیل وُلر میں داخل ہوتا ہے۔ حدِّنظر تک سمندر کی طرح نیلا پانی پھیلا ہُوا تھا۔ اور دُور، بہت دُور چاروں طرف ایک سلسلۂ کوہ ایک نیلگوں دیوار

کی طرح نظر آرہا تھا۔ مرغابیوں کے جھنڈ کے جھنڈ جھیل کے اُوپر پرواز کر رہے تھے۔ چار پانچ کشتیاں جھیل کی سطح پر بچّوں کی ناؤ کی طرح کم زور اور بے کس سی نظر آرہی تھیں۔ ہوا ساکن تھی۔ ورنہ اگر ہوا زور کی چل رہی ہوتی۔ تو اِس جھیل میں بیس بیس فُٹ کی لہر کا پیدا ہونا مشکل نہ تھا۔ اور پھر پانی کی اِن طوفانی دیواروں کے آگے کشتیاں کہاں محفوظ رہ سکتی تھیں۔

لیکن اگرچہ ہم سارا دن ایک کشتی میں بیٹھ کر جھیل میں گھومتے رہے۔ ہوا بالکل ساکن رہی۔ اور جھیل کی سطح نیلے رنگ کے شیشے کی طرح بالکل شفاف اور غیر متحرک۔ ہم نے سری بٹ ناگ دیکھا۔ یہ ایک بہت بڑا بھنور تھا جو جھیل کی مغربی سمت میں ایک گول دائرہ بناتا ہُوا گھوم رہا تھا۔ اور بہت خوفناک معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ہم نے کشتی کے ملّاحوں کے کہنے پر بھی دُولہ کے اِس بے تاج بادشاہ کو ایک پیسہ تک نذر دینا گوارا نہ کیا۔ اور پھر ہم نے سری بٹ ناگ کا ایک وزیر بھی دیکھا جو ایک چھوٹا سا بھنور تھا۔ اور پہلے بھنور سے قریباً چار میل کی دُوری پر واقع تھا۔ یہاں البتہ گورنجش نے جو تیرنا کم جانتا تھا۔ ایک دو ناشپاتیاں وزیر کی نذر کیں۔ جو خُدا جانے کتنے دِنوں سے بھوکا تھا۔ کیونکہ ملّاحوں کے کہنے پر ہمیں معلوم ہُوا۔ کہ آخری حادثہ اِس سے دو مہینہ پیشتر تین انگریزوں کو پیش آیا تھا جو اِس جھیل میں کشتی چلاتے چلاتے اُن طوفانی لہروں کا شکار ہو گئے جو فی الفور ایک تیز جھکڑ کے چلنے سے پیدا ہو گئیں تھیں۔

سہ پہر کے بعد جب ہم جھیل کی سیر سے بوٹے تو زینی اور عزیزا دونوں کو زار و قطار روتے ہوئے پایا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ زینی کا خاوند سوپور سے پنجاب چلا گیا ہے، روزگار کی تلاش میں۔ ایک آدمی سوپور سے آیا تھا۔ وہ اُدھر سے گذر رہا تھا۔ اور اُس سے پوچھنے پر یہ سب حال معلوم ہوا۔ ہم نے زینی اور عزیزا کو جہاں تک ہو سکا تسلی دینے کی کوشش کی۔ لیکن اُن کے آنسو تھمنے میں نہ آتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو اب بالکل بے یار و مددگار پاتے تھے اور بچوں کی طرح روئے جا رہے تھے۔

طبیعت بہت عرصہ تک کبیدہ رہی۔ یہ لوگ کتنے بے وقوف ہیں۔ رونے سے کیا ہوتا ہے؟ اور پھر کیا اِس بے وقوف کشمیری کو اِس کے اپنے وطن میں کوئی کام نہیں مل سکتا تھا؟ پنجاب میں اُسے کیا قارون کا خزانہ مل جائے گا؟ گدھے؟ بیوقوف غریب، اِن میں عقل تو بالکل نہیں ہوتی محض بوجھ اُٹھانا جانتے ہیں، خچروں کی طرح۔ انہیں انسان سمجھنا ہی حماقت ہے۔ اِن کے ساتھ خچروں کا سا ہی سلوک ہونا چاہیئے۔ غریب لوگ غریب ہی رہیں تو ٹھیک کام کرتے ہیں۔ اگر انہیں پیٹ بھر کر کھانا ملنے لگے۔ تو اکڑ جاتے ہیں۔ غرضیکہ طبیعت بہت منغّص رہی۔ ہم سب لوگ اپنے آپ کو قصوروار سمجھ رہے ہیں۔ اور یہ احساس ہمیشہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ آخر کھانا کھانے کے بعد جب لال کے لطیفوں سے طبیعت کچھ قدر بہلی۔ گوربخش نے گراموفون پر چند دِلکش ریکارڈ

سنائے۔ اور ہماری محفل پھر قہقہوں سے گونج اُٹھی۔

(۳)

دس بجے کے قریب جب "برج" شروع کی گئی۔ تو میں درد سر کا بہانہ کر کے اُٹھ آیا۔ دراصل میں برج کھیلنا نہیں چاہتا تھا۔ پہلے میں سونے کے کمرے میں گیا۔ پھر میں نے کچن میں جاکر پانی کا ایک گلاس پیا۔ لیکن طبیعت میں بے کلی بدستور موجود تھی۔ میں کچن سے ہوتا ہوا باہر ڈونگے کے کھلے فرش پر آ گیا۔

زینی ہاتھ میں چپو لئے ہوئے جھیل کے نیلے پانی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ ڈونگے کے کنارے پر بیٹھی تھی۔ اور اُس کے قدموں میں عزیز الیٹا ہوا تھا، نہیں، وہ رو رو کر سو گیا تھا۔ اُس کی پلکوں پر آنسو ابھی تک چمک رہے تھے (اس کے لبوں سے اب بھی کبھی کبھی کوئی سینے میں دبی ہوئی سسکی نکل جاتی تھی۔)

اور زینی؟ —— وہ کیا سوچ رہی تھی؟ کیا اُس کی نظر جھیل کی وسعتوں سے پرے پنجاب کے میدانوں تک پہنچ رہی تھی۔ جہاں اِس ظالم پردیس میں شاید کسی لکڑی اور لوہے کی دکان کے آگے اُس کا خاوند لیٹا ہوا تھا۔ دن بھر کی محنت مشقت سے چور —— ایک تھکے ہوئے خچر کی طرح ہانپ رہا تھا۔ زینی کا چہرہ اداس تھا۔ اُس کی آنکھیں جیسے خلا میں کچھ دیکھ رہی ہوں۔

"زینی!" میں نے آہستہ سے کہا۔

وہ خاموش بیٹھی رہی۔

"مجھے بہت افسوس ہے زینی!"
زینی کا سینہ زور زور سے حرکت کرنے لگا۔
"زینی! تم گھبراؤ نہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔
"صاحب، اب ہم کیا کریں گے؟" زینی نے گلوگیر لہجہ میں کہا۔ "اب ہمارا اس دُنیا میں کوئی نہیں ـــ ایک خاوند تھا۔ وُہ پردیس چلا گیا۔"
"عزیزا چھوٹا سا بچہ ہے......"
"میں عورت ذات ہوں......"
"ہائے اب کیا ہوگا؟"
" زینی کی سسکیاں تیز ہوتی گئیں، میں اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اور اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا:۔
"کیوں گھبراتی ہو زینی، تمہارا خاوند ضرور پردیس سے واپس آجائیگا۔ اور" زینی نے روتے ہوئے کہا۔ "صاحب میں مرجاؤں گی۔ اور چھوٹا عزیزا بھی بھوکا مر جائیگا۔ ہائے اُس نے ہمیں دھوکا دیا!"
"مت گھبراؤ زینی۔" میں تمہارے لئے......میرا مطلب ہے میں تمہاری ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہوں۔ ہاں تم روتی کیوں ہو۔ میری اچھی زینی۔ مجھے تم سے بے اندازہ محبت ہے، بے اندازہ محبت۔ میں تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں......"
یہ کہتے ہوئے میں نے اُس کے ہاتھ میں پانچ روپے کا ایک نوٹ تھما دیا جیسے چراغ بجھنے سے پہلے شعلے کی ایک بلند لپک پیدا ہوتی ہے۔

اسی طرح زینی کی آنکھوں میں وہی پرانی چمک پیدا ہوئی۔ لیکن پھر فوراً ہی بجھ گئی۔ تیل ختم ہو چکا تھا۔ اور پھر غریبوں کے پاس سرمایہ ہوتا ہی کیا ہے۔ زینی ایک ٹوٹی ہوئی بیل کی طرح میرے آغوش میں گر پڑی۔ اور اس نے اپنے آنسوؤں سے تر چہرے کو میرے بازوؤں میں چھپا لیا۔ اور زور زور سے سسکیاں لینے لگی۔"

چاند کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ ستارے نادم تھے۔ وہ جہلم کی سطح پر باسی پھولوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ ہوا کنول کے پتوں کے قریب سے گزرتی ہوئی آہیں بھر رہی تھی۔ کائنات کا ہر ذرہ سر جھکا کر اداس لہجہ میں کہہ رہا تھا۔ تم نے ہمیں خرید لیا۔

صرف ڈرائینگ روم سے گل بخش کے گانے کی بلند آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ جھوم جھوم کر گا رہا تھا۔

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

بے رنگ و بو

"بے رنگ و بو"

سکھ دُکاندار نے جو آٹا نون تیل بیچتا تھا، آہستہ سے کہا ــ "میرے مکان میں تھوڑی سی جگہ خالی ہے۔ آپ خود چل کر دیکھ لیجیے۔ کرایہ بھی کم ہے۔ صرف نو روپیہ ماہانہ۔ میں خود آپ کے ساتھ گلی میں چلتا ہوں"۔

سکھ دوکاندار نے سائیکلوں کی دوکان کے مستری کو آواز دی۔

او رحمو! او رحمو! ذرا میری دوکان کا خیال رکھنا۔"

"کوئی فکر نہ کرو سردار صاحب!"

سکھ دوکاندار جہاں رہتا تھا وہاں چھوٹا سا مکان تھا۔ ایک ہی منزل، ایک ہی رہنے کا کمرہ، سیڑھیوں کے قریب ایک چھوٹا سا تنگ گھر خالی تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی اندر کی طرف کھلتا ہوا ایک چھوٹا سا آنگن۔

"بس! اس چھوٹی سی جگہ کے لئے نو روپیہ ماہانہ کرایہ۔"

سیٹھ دوکاندار نے ایک پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا۔" تو اور کیا، ہم بھی تو روپیہ ہی دیتے ہیں۔ بجلی اور پانی کے نل کا کرایہ ملاکر بارہ روپے ہو جاتے ہیں۔ مہینہ بھر میں بمشکل تیس پینتیس روپیہ کماتا ہوں، بارہ روپے مالک مکان کو دے دیتا ہوں۔ آٹھ دس روپیہ حکیم صاحب کی نذر کرتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں، بیوی بچوں والے گھر میں آٹھ دس روپیہ کچھ زیادہ نہیں۔ باقی...... باقی مشکل سے گذر ہوتی ہے۔"

سیٹھ دوکاندار کی زرد زرد بیوی الگنی پہ ڈھلے ہوئے فراک ڈالنے کو نکلی۔ ایک بچہ اس کی دھوتی کا کونا پکڑے روئے جاتا تھا۔ ایک بچہ وہ گود میں اٹھائے تھی جو اپنے ننھے ہاتھوں میں کھانڈ کے بتاشے پکڑے ہوئے تھا۔ ایک بچہ اُسکے پیٹ میں تھا۔

سیٹھ دوکاندار نے کھانستے ہوئے کہا ۔" تو یہ گھر ۔ آپ آپ کو پسند نہیں ؟"

"جگہ تو اچھی ہے، لیکن ذرا ۔ اس کمرے میں اندھیرا بہت ہے۔"

سیٹھ دوکاندار کی کھانسی تیز تر ہوتی چلی گئی۔ آخر رُک رُک کر بولا،

"ہاں...... اندھیرا...... اندھیرا، دو روپے ماہانہ میں اندھیرا نہ ملے گا تو اور کیا روشنی مل سکتی ہے؟"

....

یہ گلی پکی تھی، صاف ستھری، سہ منزلہ مکان، دوہرے دروازے۔ مچھروں اور مکھیوں کو روکنے کے لئے، جگہ جگہ قہقہوں کی آوازیں، گراموفون

کے ریکارڈ کی صدائیں، ایک مکان دیکھا، بہت بڑا مکان، سُرخ سیمنٹ کا فرش۔ تین چار کرایہ دار پہلے ہی سے رہتے تھے، صرف ایک حصّہ جو دو کمروں پر مشتمل تھا، خالی تھا۔ کرایہ پندرہ روپے۔

مجھ سے کسی نے کہا۔ "مالکِ مکان عقب کی گلی میں رہتے ہیں۔ آپ اُن سے معاملہ طے کر لیجیے۔"

عقب کی گلی کے آخری کونے پر جنوب کی طرف اُن کا مکان تھا۔ گھنٹی بجائی تو ہنستے ہوئے باہر نکلے۔

"نمستے!"

"جی، نمستے، آپ اِس (ہاتھ سے اشارہ کر کے) کمرے میں تشریف رکھیے۔ میں ابھی کھانا ختم کر کے آتا ہوں، بس، میں ایک منٹ میں آجاؤں گا۔ مجھے دفتر بھی جانا ہے۔"

دُوسرے کمرے میں ایک تنگ، پُرانی وضع کے صوفے پر جس پر نیلی چھینٹ کا غلاف چڑھا ہوا تھا، بابو صاحب کی بیوی لیٹی ہوئی تھی۔

"مجھے زکام ہے، معاف کیجیے گا۔ میں اُٹھ نہیں سکتی۔" مالکہ مکان نے لیٹے لیٹے اور کشمیری شال کو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔

میں نے مُسکرا کر کہا۔ "کوئی حرج نہیں، مجھے بھی زکام ہے۔"

ہم دونوں ہنسنے لگے، بابو صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ ہمیں ہنستے دیکھ کر اُن کے مُنہ کی مُسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔

"آپ نے مکان دیکھ لیا؟ پسند ہے؟" اُن کے لہجہ میں خفیف سی درشتی تھی۔

"دیکھ لیا۔ پسند ہے!"

"کرایہ ہر مہینہ ہم پیشگی لے لیتے ہیں۔"

"اچھی عادت ہے۔"

لیکن بابُو صاحب" میری بات پہ ہنسے نہیں۔ بولے، کیا آپ شادی شُدہ ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ آپ اکیلے تو نہ ہوں گے۔ آپ کے ساتھ عورتیں ہوں گی؟ اور بچے بھی، دیکھئے نا یہاں سب شریف لوگ رہتے ہیں۔"

وُہ ان دو فقروں میں اپنی معاشرت کی پُوری داستان کہہ گیا۔

"یہاں جس مرد کے پاس عورت نہیں، اُس کی نہ تو منگنی ہو سکتی ہے۔ اور نہ اُسے کوئی مکان کرایہ پہ مِل سکتا ہے اور جس عورت کے پاس بچے نہیں اُس کا خاوند دُوسرا بیاہ کر لیتا ہے، اور اگر دُوسری عورت بھی بچے نہ جنے، تو تیسرا بیاہ ......

مَیں نے اِنکار میں سر ہلایا۔

بابُو نے اظہارِ افسوس کرتے ہُوئے سر ہلایا" معاف کیجئے گا۔ یہ بہو بیٹیوں والا محلّہ ہے۔"

بابُو کی بیوی نے مُنہ دُوسری طرف پھیر لیا۔ مَیں کمرے سے باہر نکل آیا۔ دروازے کے قریب ایک جوان لڑکی بغل میں کتابیں لئے کھڑی تھی، مجھے دیکھ کر اُس کے گال تمتما گئے۔ اُونچی آواز میں بولی" وے مُنڈُو، جلدی کر، کالج کو دیر ہو گئی۔"

"آیا بی بی جی۔" نوکر ہنستا ہُوا سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہا تھا۔ کوئی سولہ

سترہ برس کا ہو گا۔ بھیگی بھیگی مسیں۔ سڈول اعضا۔۔۔۔۔

یہاں نئے مکان بن رہے تھے۔ ابھی بہت سی جگہ خالی تھی۔ یہاں ریت اُڑ رہی تھی۔ اور شور مچاتے ہوئے لڑکے ایک دوسرے پر مٹی پھینک رہے تھے۔ ننھی منی لڑکیاں ریت پر بطخوں کی طرح چلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ یا ایک لمبی رسی پر کودنے کی کوشش میں مشغول تھیں۔ بھنے ہوئے چنے بیچنے والا پاس انگیز نگاہوں سے بچوں کی طرف دیکھتا ہوا گزر رہا تھا۔ اس ریتلے میدان سے پرے، دور سامنے ایک مکان پر موٹے حروف میں لکھا تھا۔ "کرایہ کے لئے خالی ہے"

دروازہ کھلا تھا۔ ایک چھوٹا سا دالان، اس کے آگے کھلا آنگن۔ جس میں پانی کے نل کے نیچے بیٹھی ہوئی ایک بدصورت فربہ اندام عورت نہا رہی تھی۔ بغیر کسی جھجک کے بولی۔ "آپ مکان دیکھنے آئے ہیں؟" میں نے دل میں کہا۔ "اور کیا تمہیں دیکھنے آیا ہوں؟"۔ جیسے اس نے میرے دل کی بات سمجھ لی ہو۔ بولی۔ "اچھا آپ ذرا دالان میں ٹھہریئے۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ ایک سفید دھوتی پہنے ہوئے آئی۔ یہ سونے کا کمرہ، یہ بیٹھک، یہ ایک اور کمرہ، یہ بھی ایک کمرہ ہے۔ یہ رسوئی ہے۔ ذرا ناصاف ہے۔ لیکن کل تک بالکل ٹھیک ٹھاک۔ (سر ہلا کر) ہو جائیگی۔ کرایہ بیس روپے۔ ہم پیشگی لیتے ہیں، اچھے کرایہ داروں کو دیتے ہیں دوسری منزل میں ایک ایک صاحب کے "گھر والے" رہتے ہیں۔ اُن کی تین لڑکیاں ہیں۔ کالج میں

پڑھتی ہیں۔ تیسری منزل میں ایک پروفیسر صاحب اور اُن کی بیوی اور بچے......"

میں نے پوچھا۔ "اور تیسری منزل سے اُوپر؟"

وُہ حیران ہو کر بولی۔ "تیسری منزل سے اُوپر — اِس سے اُوپر چھت ہے۔ سونے کے لئے کھُلی جگہ۔ اور ایک طرف رفعِ حاجات کے لئے تین کمرے۔"

"ہوں!" میں نے کچن کے فرش کو ٹھوکر لگاتے ہوئے کہا۔ "یہ فرش ذرا ناصاف ہے کل تک......." (سر ہلا کر) پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ "آپ شادی شدہ ہیں نا؟"

"نہیں، لیکن میرے ساتھ میری خالہ ہوں گی۔ اور خالہ کی لڑکی، اور خالہ کی لڑکی کی لڑکیاں۔"

"اوہ۔ اچھا۔ پھر تو ٹھیک ہے، لیکن کرایہ پیشگی دینا ہوگا۔ کم از کم ایک دو مہینوں کے لئے۔ کئی کرایہ دار بغیر کرایہ ادا کئے ہی رُخصت ہو جاتے ہیں۔"

"ہاں بہن! تمہیں ابھی پچھلے مہینے ہی آٹھ روپے کا نقصان اُٹھانا پڑا۔" اب یہ ایک نوجوان عورت چپکے سے کہیں سے نکل آئی تھی۔ اچھے نقش تھے۔ لیکن چہرہ کچھ اُترا ہُوا۔ کچھ اُداس سا۔ بڑی بڑی آنکھیں لیکن ملول، رنجیدہ، لبوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ، لیکن پھیکی، تاسف انگیز۔ گویا کہہ رہی تھی۔ اِس سے کیا فائدہ۔ وُہ دن بھر دفتر میں کلرکی

کرتے ہیں۔ اور میں لبوں پر سُرخی لگا کر برتن مانجتی ہوں۔ آخر اِس زندگی کا کیا فائدہ۔ وُہ شام کو تھکے ماندے آتے ہیں۔ اور پھر دفتر کے کام میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اور رات کو ــــ میرے لبوں کی سُرخی دیکھتا ہی کون ہے۔ ہائے، یہ زندگی کس قدر پھیکی اور بے مزہ ہے۔

"یہ بھی ہمارے ساتھ ہی رہتی ہیں۔" مالکہ مکان نے مجھے بتایا "ان کے ــــ بجلی کے دفتر میں نوکر ہیں۔"

مَیں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "جی بہت اچھا، نمستے جی۔"

کلرک کی بیوی نے خوش ہو کر کہا۔ "آپ ــــ یہ مکان کرایہ پر لے رہے ہیں؟"

"جی، سوچ رہا ہوں۔ میرے ساتھ خالہ ہوں گی۔ خالہ کی لڑکی۔ خالہ کی لڑکی کی لڑکیاں۔ اور . . . ."

"تو ہرج ہی کیا ہے؟" اِس نے خود بخود ہنستے ہُوئے کہا۔ "ہم سب بہنیں مِل جُل کر گزارہ کر لیں گی۔ گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے نا۔ اور پھر یہ مکان بڑا اچھا ہے۔" اِس نے کچن کے فرش کو پاؤں سے بجاتے ہُوئے کہا۔

"یہ فرش ذرا ناصاف ہے۔" بدصُورت فربہ اندام عورت ایک کل کی طرح بول اُٹھی۔ "کل تک (میر ملا کر) ۔"

مَیں آہستہ آہستہ باہر دالان کی طرف مُڑنے لگا۔ نوجوان عورت کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر تم یہ مکان لے

لیتے مجھے تمھاری محبت تو درکار نہ تھی۔ اور میں اِس قسم کی باتوں کو پسند بھی نہیں کرتی۔ لیکن یوں ہی دِل بہلا رہتا۔ وُہ دِن بھر دفتر میں رہتے ہیں۔ صبح سے لیکر شام تک۔ تم کبھی کبھی کنکھیوں سے مجھے دیکھ لیا کرتے اور میرے لبوں کی سُرخی چمک اُٹھتی۔ کیا ہی اچھا ہوتا۔ افسوس یہ زِندگی کتنی پھیکی اور بے رنگ و بُو ہے۔

"میں کل تک آپ کو بتا سکوں گا، نمستے!"

"نمستے!" دونوں عورتوں نے کہا۔

. . . .

ریتلے میدان میں ایک گوری رنگت کا مزدور لکڑیاں چیر رہا تھا۔ کھٹ کھٹ، کھٹا کھٹ۔ مجھے گزرتے دیکھ کر رُک گیا۔

"سلام صاحب!"

"سلام! کہاں کے رہنے والے ہو۔ کشمیری ہو۔"

"نہیں صاحب کلّو کا گدّی ہوں۔"

گورا رنگ، تنے ہُوئے پٹھّے۔ بہت میلی نکّر۔ پھٹی ہُوئی قمیض، کشادہ چھاتی اور ہاتھ میں ایک مضبوط کلہاڑی۔

"کلّو، کلّو؟"

"جی سرکار۔"

"بیوی ہے؟"

گدّی نے ہنستے ہُوئے جواب دیا۔ "جی سرکار!" بیوی کے نام پر ہر

ہندوستانی کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ کیا ہُوا۔ اگر وہ غلام ہے اکم از کم اُس کا بھی تو ایک غلام ہے!

گدّی اپنی خوش قسمتی پر نازاں مسکرا رہا تھا۔ اُس کے بڑے بڑے مَیلے دانت سُرخ مسوڑھوں میں نقلی طور پر جڑے ہُوئے معلوم ہوتے تھے۔

"بچّے بھی ہوں گے؟"

"جی سرکار! ایک لڑکا ہے، ننھا سا۔ (ہاتھ سے اشارہ کر کے) اتنا سا؟"

"انہیں بھی ساتھ لائے ہو؟"

گدّی کی مُسکراہٹ جیسے کسی نے پاؤں تلے مسل دی ہو۔ اُس نے آہستہ سے اِنکار میں سر ہلا دیا۔ بولا۔ صاحب، کوئی کام دیجیے۔ مَیں لکڑیاں خوب چیرتا ہُوں۔"

"ایک من کا کیا لیتے ہو؟"

"ایک آنہ۔"

"ایک آنہ؟ صرف ایک آنہ۔ ارے صرف ایک آنہ؟ آدھے دن کی کمائی۔"

"سرکار، لوگ ایک آنہ بھی نہیں دیتے۔"

"تم واپس کلّو کب جاؤ گے؟"

لکڑی چیرنے والا ریت پر بیٹھ گیا اور حُقّہ پینے لگا۔ شاید وُہ دھوئیں کے حلقوں میں کلّو کے سرسبز مرغزار، برفانی چوٹیاں، کالی سلیٹ کی چھتوں والے گاؤں۔ اور اپنی بیوی اور ننھے بچّے کی تصویریں دیکھ

رہا تھا۔

میں آگے بڑھ گیا۔ لکڑہارے نے یاس انگیز لہجہ میں کہا۔ "صاحب! کوئی کام بتائیے!" . . . .

شام کو میں پھر اپنے سرائے نما ہوسٹل کے دروازے پر واپس پہنچ گیا۔ قید خانے کی طرح تنگ کمروں کی قطاریں، بھُنی ہوئی پیاز کی بُو۔ بڑے سے آنگن میں بے ترتیبی سے بچھے ہوئے پلنگ۔ آٹھ دس لڑکوں کے مجمع میں راج ہنس چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ "ہم انقلاب چاہتے ہیں۔ بورژوا عمومی انقلاب۔ اور پھر اشتراکی انقلاب۔ اور پھر خالص سو فیصدی مارکسی انقلاب ہم ایک نئے تمدن، ایک نئی تہذیب، ایک نئی معاشرت کی بنا پر ایک نئے انسان کی تخلیق چاہتے ہیں ہم . . . . . ." بیچارہ راج ہنس۔

مطبخ کا ملازم میرے قریب سے گذر گیا۔

میں پکارا۔ "او دینے! آج کیا پکا ہے؟"

"ساگ، دال اور کاشی پھل۔"

۷ ۹ نمبر میں رہنے والا براہمن لڑکا رام نام کی دھوتی پہنے باتھ روم میں نہانے جا رہا تھا۔ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور بستر پر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

راج ہنس اپنی بار یک سی آواز میں اب تک چلّا رہا تھا۔ "ہم اس استعماری نظام کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔ اسے پیس کر رکھ دیں گے۔ اس کے پرخچے . . . ."

بھیّالال کمرے میں داخل ہُوا۔ اُس نے اُداس لہجہ میں پوچھا۔ "تم نے مکان لے لیا؟ اب تم ہمیں چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟ اپنے سب رفیقوں کو؟"

مَیں نے جواب دیا۔ "میرے لئے یہ سرائے ہی بہتر ہے۔"

آنسوؤں والی

ہم دونوں تربیٹ کے ڈاک بنگلے میں آرام کرسیوں پر لیٹے اونگھ رہے تھے۔ آتشدان میں لکڑیاں چٹخ رہی تھیں اور بند دریچے کے شیشوں میں سے برف کے اُن بڑے بڑے سفید گالوں کو دیکھ سکتا تھا جو سیب کے پھولوں کی طرح خوبصورت تھے۔ اور نہایت خاموشی سے دریائے جہلم میں گر رہے تھے۔ جہلم میں پانی ہر لحظہ بڑھ رہا تھا۔ دریا کے کناروں پر درخت برف کا سفید لبادہ اوڑھے چپ چاپ کھڑے تھے۔ چاروں طرف ایک عجیب خاموشی، ایک گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید ہم پریوں کے ملک میں آگئے ہیں۔

میرا ساتھی جو انجنیئر تھا یکایک آرام کرسی پر اُٹھ بیٹھا اور میری

طرف جھک کر کہنے لگا۔ کیوں دوست، کیا تمہیں جادو، سحر و افسوں اور اس قسم کی باتوں پر یقین ہے؟

میں نے خوابیدہ انداز میں سر ہلا دیا۔ انجنیئر کا چہرہ بھولے بسرے مگر پُر مسرت ایام کی یاد سے چمک اُٹھا۔

اُس نے ایک سگار سلگا لیا اور کہنے لگا۔ میں تمہیں ایک کہانی سُنانا چاہتا ہوں۔

ایک دفعہ مجھے سہرا اور گاٹیاں کے درمیان جموں کے علاقے کی طرف ایک خراب اور کچی سڑک کا معائنہ کرنے کے لئے جانا پڑا۔ یہ سڑک پہاڑوں کو کاٹ کر نئی نئی بچھائی گئی تھی۔ اور مجھے جلد از جلد معائنہ کر کے اس کے متعلق اپنے افسروں کو مطلع کرنا تھا۔ کہ آیا یہ سڑک خشک موسم میں موٹروں کی آمد و رفت کے لئے موزوں ثابت ہو سکے گی یا نہیں۔ افسر لوگ بھی اس سڑک کی تکمیل کے لئے بہت بیقرار نظر آتے تھے۔ کیونکہ یہی وہ سڑک تھی جو گاٹیاں کی خاموش اور پُر سکون وادی کو باہر کی دُنیا اور اُس کی تہذیب سے ملا رہی تھی۔

یہ سڑک کوئی ایک سو ستر میل لمبی ہوگی۔ اور سہرہ سے گاٹیاں تک جاتی تھی۔ میں نے اپنا معائنہ سہرہ سے شروع کیا۔ سہرہ ایک خوشنما جگہ ہے۔ چھوٹی چھوٹی گول گول پہاڑیاں، چوٹیوں پر کہیں صنوبر کے درخت آسمان کی شفاف اور نیلی سطح پر سیاہ سائے بناتے ہوئے پہاڑیوں سے نیچے اُتر کر ایک سبز شاداب سطح مُرتفع اور اُس پر چند ایک بھوری جھونپڑیاں

جو آفتاب کی کرنوں میں کندن کی طرح چمک رہی تھیں۔ ہاں شہرہ واقعی ایک اچھی جگہ تھی اور میں نے اسے بہت پسند کیا۔ سوائے شہرہ کی چنگی کے جہاں کے افسر مجھے نہیں جانتے تھے۔ اس لئے انہوں نے مجھے دِق کرنا ہی مناسب سمجھا۔ ایک محال دار مجھ سے کہنے لگا۔ "صاحب، آپ کے اس ہٹ پر بھی محصول لگیگا۔" میں نے کہا۔ "بھئی، یہ تو پہننے کی چیز ہے۔" وہ بولا۔ "ہاں، ہے تو سہی۔ لیکن بالکل نئی نظر آتی ہے۔" دراصل چنگی کے افسر پہننے کی چیز اسے سمجھتے ہیں۔ جو نئی نہ دکھائی دے۔ نہ دھلوائی گئی ہو۔ بلکہ اچھی خاصی گندی اور ناصاف ہو۔ محصول صرف اسی صورت میں معاف ہوسکتا ہے۔

خیر، ہم شہرہ سے کوئی دس بجے کے قریب آگے چلے۔ اب ہمارے سامنے وہ سڑک تھی جو پیچ در پیچ بل کھاتی ہوئی نئے اور اجنبی علاقوں میں سے گذرتی تھی۔ مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ میری کار بھی پہلی مرتبہ اس علاقے داخل ہو رہی ہے۔ اور اس سے مجھے یک گونہ مسرت حاصل ہوئی۔ میں نے شوفر سے کہا کہ گاڑی آہستہ آہستہ چلائے کیونکہ اول تو مجھے معائنہ کرنا تھا۔ پھر سڑک بھی اکثر مقامات پر بہت تنگ تھی۔ کہیں کہیں کناروں پر گہری کھائیاں آجاتی تھیں۔ جن کی طرف دیکھنے سے بھی بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور اکثر موڑ بہت غلط طریق پر کٹے ہوئے تھے۔ ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے میلوں ہی آگے، سڑک کا معائنہ کرتے ہوئے قدرت کی دلفریبیوں کی بہار دیکھتے ہوئے۔ دور اوپر آسمان میں چیلیں پر تولے ہوئے گھوم رہی تھیں۔

نیچے زمین پر لمبی لمبی کھیتیاں پہاڑوں کے دامن سے شروع ہوتیں اور پھر
کسی پرانے قلعے کی سیڑھیوں کی طرح اوپر ہی اوپر چڑھتی چلی جاتیں۔ کبھی کبھی
کوئی وسنت کا درخت اپنے سرخ سرخ پھولوں کی شمعیں لٹکائے ہماری موٹر
کے قریب سے دوڑتا ہوا گزر جاتا۔ ایک جگہ ہمیں ایک چھوٹی سی ندی کو عبور
کرنا پڑا جہاں کم بخت سب انجینئر پل تو کیا ایک DIVERSION تک بنانا بھی بھول
گیا تھا۔ ہم نے اس چھوٹی سی شور مچاتی ہوئی ندی کو کار کی پوری رفتار سے
عبور کیا۔ پانی میں سے گزرتے وقت انجن سے نغمے نکلنے لگے۔ اور گاڑی کے
پہیے چھوٹے چھوٹے پتھروں پر ناچتے ہوئے گزر گئے۔ موسم خزاں کا
تھا۔ لیکن یہاں کی خزاں بھی کتنی حسین تھی۔ کشمیر میں گلمرگ سے زیادہ
خوبصورت وادی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ میں نے خزاں میں بہار کے گیت گائے۔ میں نے
اپنے شوفر کو گاڑی اچھی طرح چلانے پر مبارکباد دی۔ ہم نے ـــ یکایک
ایک دھچکا سا لگا جس سے ساری کار کانپ اٹھی۔ پھر ایک اور دھچکا۔ اور اب
کار وہیں کی وہیں کھڑی ہو گئی۔ خاموش اور چپ چاپ، صرف انجن ایک
بچھڑے ہوئے بھیڑ کے بچے کی طرح چلا رہا تھا۔

ہم کار سے اترے، میں اور میرا ہوشیار ڈرائیور، ایک اچٹتی ہوئی
نگاہ سے ہم نے دیکھ لیا کہ کار کو کیا حادثہ پیش آیا ہے۔ چپ چاپ یہ کم بخت
کچی سڑک درمیان میں سے بیٹھ گئی تھی۔ اور کار کے پچھلے بائیں پہیے کو اپنی
جگہ سے ہلا گئی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ
آج ہمیں یہیں سردی میں رات بھر ٹھہرنا ہوگا۔ اتنا کہہ کر میں نے ادھر ادھر

دیکھا۔ اور اُسی وقت مجھ پر وُہ احساس طاری ہُوا جیسے آپ سحر یا جادُو یا افسوں جو جی چاہے کہہ پُکار سکتے ہیں۔

یہ ایک تنگ وادی تھی جسکے دونوں طرف نیم دائرہ بناتے ہُوئے اُونچے اُونچے پہاڑ کھڑے تھے۔ وادی کے عین درمیان پہاڑوں کو چیر کر ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ اِس کا پانی ڈُوبتے ہُوئے سُورج کی شعاعوں میں ایک سونے کی لکیر کی طرح چمک رہا تھا ہمارے بالکل ہی قریب دیودار اور شاہ بلوط کے درخت کھڑے تھے۔ خاموش، چُپ چاپ، جنگل کے سپاہی، جو شاید عشق و محبّت کے وُہ حیرت ناک افسانے سُن رہے تھے۔ جنہیں مغربی ہوائیں دُور دُور کے مُلکوں سے اُڑا کر لائی تھیں، پرے جنگل کے قریب ایک خوبصورت گھر تھا، چکنی مٹّی کا بنا ہُوا اور سپید کھریا سے لپا ہُوا۔ اِس کے قریب ہی نیچے سڑک کی طرف، ایک عالی شان چنار اپنے بازو پھیلائے کھڑا تھا۔ جسکے گھنے سائے میں ایک ٹھنڈا چشمہ گنگنا رہا تھا۔

(اِس حسین منظر نے مجھ پر ایک بے خودی کی کیفیت طاری کر دی) اور میں وہیں سڑک کے درمیان کھڑا رہ گیا۔ پھر یکایک ڈرائیور کے یہ تلخ الفاظ میرے کانوں میں گونج اُٹھے۔

"صاحب افسوس ہے مگر ہم آج آگے نہیں جا سکیں گے۔"

میں نے یہ سُن کر مُنہ موڑ لیا۔ اور چشمہ کی طرف چل پڑا۔ چشمے کا پانی بہت ٹھنڈا اور صاف تھا۔ میں نے ہاتھ مُنہ دھویا اور خوب سیر ہو کر پیا، اس کی جان بخش تازگی نے اُس درد کو بھی دُور کر دیا جو سفر کی تکان کی وجہ سے

میری کن پٹیوں میں پیدا ہو گیا تھا۔ "پانی ٹھنڈا ہے نا ہی؟" ایک نازک آواز آئی۔ میں نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا، ایک عورت تھی جو اپنے داہنے بازو اور کمر کے درمیان ایک مٹی کی ٹھلیا تھامے تھی۔ اِس طرح جیسے کوئی ماں اپنے ننھے بچے کو تھامے ہوئے ہو۔ وُہ کِسی قسم کی آہٹ پیدا کئے بغیر ایک وحشی ہرنی کی طرح، یہاں کے چشمے کے کنارے پہنچ گئی تھی اور اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بھی ایک ہرنی کی سی وحشت اور نرمی پائی جاتی تھی۔

میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور تعظیم کے طور پر ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولا "جی ہاں، پانی بہت ٹھنڈا اور میٹھا ہے۔ ایسا میٹھا چشمہ تو میں نے اِس علاقے میں کہیں نہیں دیکھا۔"

اُس نے مجھے عجیب لگا ہوں سے دیکھا اور پھر سر ہلا کر بولی۔ "تم مجھے اِس علاقے کے رہنے والے معلوم نہیں ہوتے۔" میں نے مسکین لہجے میں کہا "کاش کہ ایسا ہوتا۔"

اِس کے پتلے پتلے لبوں پہ ایک لرزش سی پیدا ہوئی۔ کہنے لگی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے جو اِس جنگل کا رہنے والا نہیں ہے وُہ اِس جنگل کا رہنے والا کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں نے شرم سے اپنا سر جھکا لیا۔ اور اُس کے نازک ٹخنوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اِس کے ننگے پاؤں کی طرف۔ بلاشُبہ میں اِس جنگل کا رہنے والا نہیں تھا۔

وہ کچھ عرصہ خاموش رہی۔ پھر اُس نے نیچے سڑک پر کھڑی ہوئی کار دیکھ لی۔
"وہ کیا ہے، کیا یہ وُہی چیز تو نہیں جس کے متعلق میرے بابا نے کہا تھا کہ ایک دن یہاں آئے گی۔ اور اِس سارے علاقے پر قبضہ کر لیگی؟"

میں نے وحشی ہرنی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

جب وُہ میری باتیں سن چکی تو سر ہلا کر کہنے لگی۔ "اوں ہوں، یہ کوئی اچھی چیز نہیں۔ ایک گھوڑا اِس سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ مجھے اِس سے ڈر لگتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بُرے دن آرہے ہیں۔"

یہ کہکر وُہ چشمے کے کنارے بیٹھ گئی۔ اُس نے ہتّی کی ٹھلیا کو چشمے میں پھینک دیا۔ اور اپنے داہنے ہاتھ کی اُنگلیوں سے اُسے ننھے ننھے ہچکولے دینے لگی۔ جیسے کسی کھلونے سے کھیل رہی ہو۔ اُس کی آنکھیں خوابیدہ سی ہو گئیں۔ جیسے کوئی عجیب سا سپنا دیکھ رہی ہو۔ وُہ کیا سوچ رہی تھی۔ جنگل کی حسین شاعرہ جب وُہ اِس طرح چشمے کے کنارے اپنے خیالوں میں مست ٹھلیا کو اپنی اُنگلیوں میں تھامے سوچ رہی تھی۔ تو یکایک سُورج کی آخری کرنیں اُسکے چہرے پر پڑیں۔ اُن کُندنی کرنوں کے جھلملاتے ہُوئے ارغوانی ہالے نے اِس کے چہرے کو اور بھی حسین اور پُر اسرار بنا دیا۔ اور یکایک مجھے احساس ہُوا کہ یہ کوئی معمولی عورت نہیں تھی، بلکہ خود جنگل کی دیوی تھی۔ جسے ایک حقیر انسان نے دُنیائے تہذیب سے بہت دُور، ایک خاموش جنگل میں، ایک پُر اسرار وادی میں، ایک نیلے چشمے کے قریب بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ ہاں وُہ جنگل کی دیوی ہی تو تھی، خوبصورت، پُر اسرار، وحشی، گمنام اور معصوم!

ٹھلیا دیر تک چشمے میں ناچتی اور گنگناتی رہی اور آخر کار پانی سے بھر گئی۔ پھر یکایک اس کی مالکہ بھی اپنی خوابوں کی دنیا سے اس غیر دلچسپ اور پھیکی دنیا میں لوٹ آئی۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا "نیرا" یہ کہہ کر اس نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ اور ایک ہلکی سی سرخی اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔

"اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔" میں نے اس سے کہا۔ تمہارا نام تو بہت اچھا ہے۔ نیرا یعنی آنسوؤں والی، گو میں تم میں رونے کی کوئی بھی کیفیت نہیں دیکھتا۔ سوائے تمہاری آنکھوں میں جن کی ملائمت اور نرمی کسی ہرنی کی آنکھوں کی یاد دلاتی ہے۔

اس پر وہ اور بھی شرمائی، شاید اپنی تعریف سن کر خوش ہو گئی۔ پھر وہ آہستہ سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے ٹھلیا پانی سے نکال کر اپنے سر پر رکھ لی اور اپنے دونوں بازو اس کے نیچے باندھ لئے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ کیا ہمیں رات بسر کرنے کے لئے کوئی جگہ مل سکتی ہے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ میرا شوفر بھی میرے ساتھ ہی ہے۔"

نیرا نے فوراً جواب دیا۔ "کیوں نہیں، بے شک میرے بابا آپ کو ضرور جگہ دیں گے۔ آیئے۔ گو ہم بہت غریب لوگ ہیں۔ لیکن یہاں اور کوئی رہتا بھی نہیں۔ میرے ساتھ آیئے۔"

دو دن کے بعد سحر کے دھندلکے میں، اسی سڑک کے کنارے میں اور نیرا ایک

دوسرے کو الوداع کہہ رہے تھے۔ ڈرائیور نے آخر کار کام کو درست کر لیا تھا۔ اور اب ہم الوداع کہنے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ میں نے نیرا کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ اور نہایت حسرت سے اُسے الوداع کہی۔ نیرا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہاں وہ آنسوؤں والی تھی، نیرا (وہ دن ہم دونوں نے اکٹھے گزارے) وہ ایک پاک صاف اور معصوم ہستی تھی۔ جیسے کہ صرف جنگل کے رہنے والے ہی ہو سکتے ہیں۔ دو دن، دو خوبصورت خوشیوں سے بھرے ہوئے دن۔ میں نے نیرا اور اُس کے والد جنگل کے بوڑھے شکاری کی سادہ اور حسین زندگی سے بہت کچھ سیکھا۔ دو دن جو مسرت افروز لمحوں کی طرح جلد ہی ختم ہو گئے ہیں، اِن دو دنوں میں نیرا نے مجھے اپنے چھوٹے سے باغیچے میں کھلے ہوئے پھول دکھائے، اپنی کیاریاں، گائیں اور دھان کے کھیت، اور میں نے؟

میں نے اُسے حسن و محبت کے افسانے سنائے اور سیاہ دلوں کی ابلہ فریبیاں بیان کیں۔ میں نے اُسے بہت سی باتوں کے متعلق خبردار کیا۔ کیونکہ وہ بہت ہی معصوم تھی۔ خطرناک حد تک معصوم۔ سب سے بڑھ کر میں نے اُسے اُس چیز کے متعلق خبردار کیا جسے لوگ تہذیب کے مقدس نام سے پکارتے ہیں۔ تہذیب، جو اب جلد ہی اس سڑک کے ذریعے اِس علاقے میں پھیلنے والی تھی۔ وہ نہایت خاموشی سے میری باتوں کو سنتی۔ ایک آہ بھر کر میرا شکریہ ادا کرتی۔ اور پھر چپ ہو جاتی اور اب ہم ایک دوسرے سے جدا ہونے والے تھے۔

میں نے چوتھی بار اُس سے کہا، اچھا نیرا الوداع!

اُس نے اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے میرے کوٹ کو پکڑ لیا۔ "مت جاؤ پردیسی"

کیا تم ضرور چلے جاؤ گے؟" سچ مچ اِس غریب لڑکی کو مجھ سے اُنس سا ہو گیا تھا۔ مَیں نے ایک خفیف مُسکراہٹ کے ساتھ نرم لہجے میں کہا۔" مَیں تم سے ملنے کے لئے آؤں گا۔ نیرا ضرور۔ ہاں، اب مجھے اجازت دو۔ اپنی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ مجھے الوداع کہو نیرا۔"

نیرا اپنے آنسوؤں کے درمیان مُسکرائی۔ سحر کے اُڑتے ہُوئے دُھندلکے میں مَیں نے دیکھا کہ نیرا کی پلکوں پر آنسو پھُول کی پتیوں پر شبنم کے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ اُس نے جلدی سے الوداع کہی اور پھر یک لخت مُنہ موڑ کر سامنے کی گھاٹی پر چڑھنے لگی۔ اُوپر، اور اُوپر، وُہ گھاٹی کے اُوپر چڑھتی گئی۔ اُس نے ایک بار بھی پیچھے مُڑ کر نہ دیکھا۔ گھاٹی کی چوٹی پر سُورج کی کرنوں نے اُس کی پیشانی کو چُوما۔ اور اُس کے گرد ایک حسین ہالہ بنا دیا۔ اب وُہ گا رہی تھی۔ ایک میٹھا پُرسوز پہاڑی گیت۔ جسکے الفاظ میرے کانوں نے نہ سُنے (لیکن جس کا جاں گداز نغمہ میرے دِل کی گہرائیوں میں اُترتا چلا گیا مَیں اُسے بیان نہیں کر سکتا۔ لیکن اُس گیت کی وُہ لے۔ وُہ اُس کا لازوال حسُن، درد اور تڑپ آج تک میرے کلیجے میں محفوظ ہے۔)

انجنیئر چُپ ہو گیا۔ کمرے میں کتنی دیر تک خاموشی طاری رہی، آگ مدھم ہو چُکی تھی۔ اور دیواروں پر لمبے لمبے سائے ناچ رہے تھے۔ بہت دیر کے بعد مَیں نے آرام کرسی سے سر اُٹھایا اور انجنیئر کی طرف مُڑ کر پُوچھا۔ کیا تُم پھر کبھی نیرا سے مِلے؟

لیکن انجنیئر سو گیا تھا۔ اُس کا سگار اُسکے ہاتھ کی اُنگلیوں سے

نِکل کر فرش پر جا گِرا تھا۔ اَور غالیچے پر جل کر راکھ ہو چکا تھا۔

بچپن

"بچپن"

رفیع کو نیلا سے بہت محبت تھی۔ یوں تو رفیع کو ہر چیز سے محبت تھی۔ خوشنما رنگا رنگ تیتریوں کو باغ میں اُڑتے دیکھ کر اُس کا دِل یکایک بے تاب ہو جاتا اور وہ اُن کے پیچھے خوشی کی وحشیانہ چیخیں مارتا ہوا پھولوں کی کیاریوں کو روندتا ہوا بھاگا بھاگا پھرتا۔ اور جھٹ سے اپنے پھندنے والی ٹوپی سر سے اُتار کر لاجوردی رنگوں والی ایک تیتری کو اِس میں قید کر لیتا۔ پھر آہستہ سے حیرت اور پیار بھری نگاہوں سے تیتری کی طرف دیکھتا۔ اُسے اپنی چھوٹی چھوٹی نازک اُنگلیوں میں پکڑ کر اِدھر اُدھر گھومتا، تیتری کے پر پھڑپھڑاتے۔ اور یکایک اُس کا دِل رحم کے جذبات سے اِتنا بھر جاتا۔ کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگتے۔ اور وہ اُسے یک لخت چھوڑ دیتا۔ تیتری اُڑتی ہوئی دُور سونف کے پودوں سے پرے شفتالوؤں کے درختوں

کی چوٹیوں سے گزر جاتی۔ رفیع حیرت بھری نگاہوں سے اُڑتی ہوئی خوبصورت تیتری کی طرف دیکھتا۔ کتنی اچھی تیتری تھی! محبّت اور افسوس۔ یکایک ایک اور تیتری، سبز اور پیلے پیلے پروں والی پہلی تیتری سے بھی زیادہ حسین اور درخشاں، سنگھاراج کے پھولوں کے اُوپر اُڑتی ہوئی دکھائی دیتی۔ اور وُہ اپنی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں سے لمبی لمبی چھلانگیں مارتا ہوا سنگھاراج کے تختوں کی طرف دوڑنے لگتا۔ اِسے واقعی تیتریوں سے محبّت تھی۔

اُسے آڑوؤں سے بھی محبّت تھی اور سیبوں سے بھی۔ اور لال لال رنگ کے شربتی انگوروں سے بھی۔ جب درختوں پر سیب سونے کے گیندوں کی طرح چمکتے اور لمبی لمبی سبز بیلوں میں پہاڑی انگور یاقوت کی طرح دمکتے۔ تو اُنہیں دیکھ کر رفیع کا دِل کسی نامعلوم خوشی سے کانپنے لگتا۔ صِرف دِل ہی نہیں بلکہ ٹانگیں بھی۔ وُہ چاہتا کہ وُہ جلد جلد درخت کی اونچی شاخوں پر چڑھ جائے۔ اور ہر ایک آڑو کو اپنے نکر کی ننھی ننھی جیبوں میں بھر لے۔ ہر سیب کو، انگوروں کے ہر خوشے کو اپنے گالوں کے اندر یا شاید اپنے دِل کے اندر چھپالے۔ وُہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ دُنیا کا کوئی اور فرد اُس کے سیبوں، آڑوؤں، انگوروں اور ناشپاتیوں کی طرف نگاہ بھی اُٹھائے۔ اُسے یقیناً اُن سے محبّت تھی۔ اور باغ کے مالی کو یہ اچھی طرح معلوم تھا۔

اور پھر اِسے اپنے ابّا سے محبّت تھی۔ جب امّاں ابّا کو کبھی جھڑک

دیتیں اور آنا اداس سی صورت بنائے آنچل کے ایک کونے سے آنسو پونچھتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ تو رفیع اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا، سہم سہم کر قدم اُٹھاتا ہوا چپکے سے آنا کے کمرے میں چلا جاتا۔ اور آنا کے سیاہ لہنگے کا کونا پکڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ اُداس، معصوم اور پیار بھری نگاہوں سے اپنی آنا کی طرف دیکھتا۔ وہ آنا کو چپ کرانا چاہتا۔ وہ اُسے ڈھارس دینا چاہتا۔ لیکن خبر نہیں کیوں وہ کچھ نہ کر سکتا۔ پھر یکا یک اُس کا دِل بھر آتا۔ اور آنا کو روتے دیکھ کر وہ بھی بے اختیار سِسکیاں لینے لگتا۔ پھر آنا اُسے اپنی گود میں لے لیتی۔ اُسے اپنے بازوؤں میں زور سے بھینچ کر چھاتی سے لگا لیتی۔ اپنے گیلے رُخسار اُس کے نرم نرم گالوں سے لگا دیتی۔ اُس کا منہ اِتنی بار چومتی کہ اِس کا دم رُکنے لگتا۔ پھر آہستہ آہستہ آنا کی سِسکیاں بند ہو جاتیں اور اُس کے آنسو خشک ہو جاتے۔۔۔ ہاں اُسے اپنی آنا سے محبّت تھی۔

لیکن آنا سے محبّت کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اُسے امّی اچھی نہیں لگتی تھی۔ امّی تو اِس کی جان تھی۔ لیکن وہ کیا کرے۔ امّاں ہی اُسے ہر وقت اپنے پاس نہیں رہنے دیتی تھیں۔ جاؤ ننھے باغ میں کھیلو۔ جاؤ مُنّے سکول جاؤ۔ رفیع سیر کو جاؤ۔ وہ جب دیکھتا، امّی کسی نہ کسی کام میں مصروف ہوتیں، امّی کچن میں جاتیں تو وہ پیچھے بھاگتا۔ اور کروشیا یا سلائیاں لیکر بیٹھتیں تو وہ صوفے کا کونا پکڑ کر کھڑا ہو جاتا اور امّی کے بالوں سے کھیلنے لگ جاتا۔ امّاں جھڑک دیتیں۔" ننھے، تم نے سبق

نہیں یاد کیا۔" اور وہ سہم جاتا۔ "جاؤ، کام کرو۔" اور وہ دھیمے دھیمے قدموں سے واپس چلا جاتا۔ اُسے تو اماں سے محبت تھی، لیکن اماں اُسے ہر وقت پیار نہیں کرتی تھیں۔ جب گھر میں مہمان عورتیں آتیں تو وہ مچل جاتا اور بار بار اماں کے پاس جا کھڑا ہوتا۔ لیکن اماں اُسے یونہی چمکار کر کہہ دیتیں "رفیع بیٹا باہر کھیلو۔"

ہاں، کبھی کبھی وہ اماں کی گھرکیوں کی بھی پروا نہیں کرتا تھا۔ اماں طشتری اُٹھائے ہوئے ابا کے لئے کھانے کے کمرے میں ناشتے ہوئے پھل لے جا رہی ہوتیں۔ کہ وہ اُن کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا۔ شریر۔ ننھے شریر رفیع کہنے سے کیا ہوتا تھا۔ وہ اردو کی تیسری کتاب اُٹھائے ہوئے اماں کے اردگرد شور مچاتا ہوا بھاگتا۔ اور انہیں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھنے دیتا تھک کر اور ہار کر وہ اُسے اپنے بازوؤں میں اُٹھا لیتیں۔ اماں کی میٹھی اور مہربان نگاہیں دیکھ کر وہ اُن کی گردن سے لپٹ جاتا۔ "میری اچھی اماں۔"

وہ اباجی کو بھی بہت چاہتا تھا۔ اگرچہ اُسے پتا تھا کہ ابا بہت بڑے آدمی ہیں۔ اور نرم لہجے میں بہت کم بات کرتے ہیں۔ پھر بھی وہ انہیں بہت چاہتا تھا۔ اگر وہ دورے پر جاتے تو وہ ہمیشہ ضد کرتا۔ "مجھے بھی ساتھ لے چلو ابا۔ اچھے اباجی، اباجی۔" لیکن اِن منتوں سماجتوں کا ہمیشہ اباجی پر کم اثر ہوتا تھا۔ اور تو اور وہ شام کو سیر کرنے کے وقت بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ چلے جایا کرتے اور بیچارا رفیع چیختا ہی رہتا۔ ابا دورے سے واپس آتے تو وہ کتنی دیر پہلے ہی ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر ابا کی راہ

دیکھتا رہتا۔ اور جب ابّا دُور سے ہی گھوڑے پر سوار ندی کے قریب کی پگ ڈنڈی پر نظر آجاتے تو وُہ فرطِ مسرّت سے چلّا اُٹھتا۔ "ابا جی آئے، وُہ آئے، وُہ آئے" ہاں وُہ ابّا جی کو بہت چاہتا تھا۔

لیکن محبت تو اُسے نیلا سے ہی تھی۔ نیلا بیگم فتح دین چپڑاسی کی لڑکی تھی۔ عُمر میں شاید رفیع سے ایک برس بڑی ہی تھی۔ شاید اِسی وجہ سے وُہ بیچارے رفیع کی پروا تک نہ کرتی تھی۔ مُمکن ہے کہ کوئی اور وجہ بھی ہو۔ لیکن اِس کا رفیع کو پتہ نہ تھا۔ بہر حال رفیع کو جتنی نیلا سے محبت تھی اُتنی ہی نیلا اِس سے بے گانہ تھی۔ اِس نے تو آج تک کبھی رفیع سے بات بھی نہ کی تھی۔ بلکہ جب کبھی وُہ رفیع کے پاس سے گزُرتی (اور رفیع کو ایسے موقعے بہت کم ملے ہونگے) تو سر اُٹھا کر اپنے خوبصورت گھونگھر والے بالوں کو جھٹکا کر اِس کے پاس سے گزُر جاتی۔ غریب رفیع کو اِس وقت بہت ہی ذہنی تکلیف ہوتی تھی۔ وُہ اُس چھوٹے سے قصبے کے ہر ننھے گڈرے سے ہنس ہنس کر بات کرتی تھی۔ مگر بیچارے رفیع کو ہی یہ مسرّت حاصل نہ ہُوئی تھی۔

یوں تو یہ کوئی بہت بڑی بات نہ تھی۔ رفیع کی معصوم زندگی میں چند ایک ہی ایسے تکلیف دہ لمحے آئے تھے۔ ورنہ دِن بھر تو وُہ نیلا کو کم و بیش یاد بھی نہ رکھتا تھا۔ سکول کی قید، ماسٹر کی گھُرکیاں۔ حساب کے سوال، جمع تفریق، ضرب تقسیم، باغ میں اُچھل کُود، رات کو وُہ جب تھک کر بستر پر لیٹتا تو بس پھر صبح امّی ہی اِسے مُشکل سے جگاتی تھیں۔

لیکن جب نیلا سامنے آجاتی یا جب وُہ باغ میں بھیڑوں سے اکیلا کھیلتا

کھیلتا اُکتا جاتا تو نیلا کی حسین گڑیا جیسی صورت کا خیال کر کے وہ ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا اور اس کا جی چاہتا کہ وہ خود نیلا کو بلا لے۔ بھلا وہ اسے کیا کہے گی۔ اچھا تو بھلا وہ اِس سے ہی کیوں نہیں بولتی۔ ایک دن جب وہ یوں ہی کھیلتا کھیلتا ندی کے کنارے چلا گیا تھا۔ جہاں ندی پہاڑ کے قدموں سے ٹکرا کر اپنا بہاؤ تبدیل کرتی ہوئی جنوب کی طرف مڑ جاتی تھی۔ تو وہاں اس نے ایک ٹیک کے بہت بڑے درخت کے نیچے بہت سے اپنے ہمجولی دیکھے۔ کئی پتنگیں بڑھا رہے ہیں۔ کئی بانسریاں بجا رہے تھے۔ کئی بچھڑی ہوئی بھیڑ بکریوں کو آوازیں دے دے کر واپس بلا رہے تھے۔ دو تین ندی کے کنارے نہا رہے تھے۔ اور ندی کے نیلے پانی میں تیرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ ایک طرف منوہر، صادق، حسنی، نوراں، کیتھری، اور بہت سے لڑکے لڑکیاں ریت کے ٹیلے کھود کھود کر عالی شان محل بنا رہے تھے۔ رفیع بھی ان کے ساتھ جا کر کھیلنے لگا۔ اُن میں نیلا بھی تھی۔ وہ بہت دیر تک اُن کے ساتھ کھیلتا رہا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں نہ اُس نے نیلا سے بات کی، نہ نیلا نے اُس سے۔ کھیلتے کھیلتے نیلا اور کیتھری جھولے کے قریب چلی گئیں اور پینگ بڑھانے لگیں۔ رفیع حیرت سے اُن کی طرف دیکھنے لگا۔ اِس نے آج تک کبھی پینگ نہ بڑھائی تھی۔ اِتنی اونچی، اُسے تو جھولے پر بیٹھنے سے بھی ڈر لگتا تھا۔

صادق بانسری بجا رہا تھا، رُک کر بولا۔ "پینگ بڑھاؤ گے؟"

رفیع اِنکار نہ کر سکا۔ خاص کر نیلا کے سامنے جو دوسرے جھولے سے

اُتر کر اب پاس کھڑی مسکرا رہی تھی۔

رفیع ڈرتے ڈرتے جھولے پر چڑھا۔ لیکن اب اسے پینگ چڑھانے کا ڈھب نہ آتا تھا۔ ناچار کہنے لگا۔ مجھے جھولا دو۔

یہ سن کر سب لڑکے لڑکیاں ہنس پڑے۔ رفیع کو ایسا معلوم ہوا۔ کہ نیلا کی ہنسی اُن سب میں سے بلند تھی۔ وہ شرمندہ سا ہو گیا اور جھولے سے اُتر کر سیدھا گھر کی طرف چلا گیا۔ وہ غمگین اور اداس جا رہا تھا۔ اسے کسی پر غصہ نہ تھا۔ صرف اُسے بار بار نیلا پر غصہ آ رہا تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے اس کی سسکیاں تیز ہو تی گئیں۔ اور جب وہ بڑے پھاٹک کے اندر داخل ہوا تو وہ زار و قطار رو رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" اناّ نے پوچھا۔

"کیوں رو رہے ہو بیٹا؟"

"بیٹا رفیع کیا بات ہے؟"

"میرے رفیع کو کس نے مارا ہے؟"

"ننھے تم اتنی دیر کہاں کھیلتے رہے۔ یہاں بچارا مالی ڈیڑھ دو گھنٹے سے تمہاری تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ بولو رفیع ننھے!"

لیکن ننھا رفیع دیر تک روتا رہا۔ آخر جب چپ ہوا تو سسکیوں کے درمیان میں رُک رُک کر بولا۔

"میں...... میں...... ایک جھولا..... ایک جھولا لگوا دو امّی"

نیلا رفیع کے ہاں کئی بار آتی۔ کبھی امّی سے مٹھائی لینے کے لئے

کبھی کوئی کپڑوں کا جوڑا لینے کے لئے، کبھی پکے ہوئے اخروٹ لینے کے لئے جو اُس کے گھر کے آنگن میں اُگے ہوئے درخت پر لگے تھے لیکن رفیع اُسے دیکھتا ہی رہ جاتا۔ کئی بار رات کو سوتے وقت جب آنا اُسے پریوں کی کہانی سُناتی۔ تو وہ سوچا کرتا کہ کیا پریاں نیلا کی طرح خوبصورت اور مغرور ہوا کرتی ہیں۔ لیکن یہ بات آنا سے پُوچھنے کا اُسے کبھی حوصلہ نہ ہوا۔ نیلا اُسے ایک مُورت کی طرح پیاری لگتی تھی کبھی وُہ سوچتا اِس کے گال کتنے لال لال ہیں اور اِس کے ہونٹ! اُس کے اپنے گالوں یا ہونٹوں کا رنگ تو اِتنا صاف نہ تھا۔ اچھا تو اگر وُہ بھی نیلا کی طرح خُوبصورت بن جائے تو کیا پھر بھی نیلا اِس سے نہ بولیگی۔ یہ خیال اُسے اُس وقت آیا جب کہ وُہ سنبلو کی ایک اونچی جھاڑی کے قریب کھڑا ہوا پکے ہُوئے سُرخ سُرخ سنبلو توڑ توڑ کر کھا رہا تھا۔ اِن سُنبلوؤں کا رنگ کتنا سُرخ تھا۔ سُنبلو کھاتے کھاتے اِس نے چار پانچ سُنبلو توڑ کر اپنے گالوں پر مل لئے اور اپنے ہونٹوں اور ٹھوڑی کو بالکل لال کر لیا۔ پھر یکایک اِسے دُوسری جھاڑی کے قریب ایک خُوبصورت تیتری دکھائی دی۔ اور وُہ نیلا کے متعلق سب کچھ بھُول گیا۔ وُہ کتنی دیر تک تیتریاں پکڑنے میں مصرُوف رہا۔ آج اِس نے سات خُوبصورت تیتریاں پکڑیں اور پھر انہیں اُس نے اپنے چھوٹے سے رومال میں جمع کر لیا۔ اور گھر لے گیا۔

اماں نے پُوچھا۔ "یہ مُنہ کیوں لال کر رکھا ہے۔ شاید آج پھر سُنبلو کھاتے رہے ہو۔ مَیں نے تمہیں کئی بار سمجھایا ہے کہ سُنبلو نہ کھایا کرو لیکن

تم مانتے ہی نہیں۔ کیوں؟ ان بچاری نیتریوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"
جب رفیع کے ایک دو طمانچے لگے۔ تو وہ زور زور سے رونے لگا۔

....

عید کے دن فتح دین کی لڑکی حسب معمول ایک رومال میں خوبانیاں باندھ کر رفیع کے گھر دینے آئی۔ رفیع گھر پر موجود نہ تھا۔ وہ باغ میں باڑ کے قریب چنبیلی کے پودوں سے پھول توڑ رہا تھا۔ اور ہار بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیلا جب خوبانیاں دے کر باغ کے قریب سے گزری تو رفیع کو باڑ کے قریب بیٹھے دیکھ کر رک گئی۔ وہ مزے سے ہار بنانے میں مشغول تھا۔

رفیع بچارے کو پتہ ہی نہ تھا کہ نیلا پاس ہی کھڑی ہے۔ یکایک نیلا نے باڑ سے ایک ٹہنی توڑی۔ رفیع نے سر اٹھا کر دیکھا نیلا تھی۔ اس کا چہرہ شرم سے لال ہوگیا۔ اس نے ہار بنانا چھوڑ دیا۔ اور اٹھ کر باڑ کے قریب کھڑا ہوگیا۔

نیلا بولی۔ "تمہارا نام رچھی ہے؟"

"ہاں، رفیع!"

"رچھی!"

"رچھی کیا نام ہے؟" نیلا نے اپنی چھوٹی سی ناک کو اونچا کر کے کہا۔

"رچھی نہیں، رفیع!"

نیلا بولی۔ "میرا نام نیلا ہے۔ ہم وہاں رہتے ہیں۔ (انگلی سے اشارہ کر کے) وہ ان اخروٹ کے درختوں کے پیچھے۔"

رفیع کہنے لگا۔ "ہمارے ہاں چنبیلی کے پھول بہت اچھے ہیں"
نیلا بولی۔ "ہمارے ہاں خوبانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں"
رفیع کہنے لگا۔ "ہمارے باغ میں بھی بہت اچھی خوبانیاں ہیں"
نیلا نے سر ہلا کر کہا۔ "جھوٹ۔ ہماری خوبانیاں سب سے میٹھی ہوتی ہیں"
رفیع کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بولا۔ "میں پتنگ بہت اونچی لے جا سکتا ہوں۔"
"اچھا؟" نیلا نے ایسے کہا جیسے اس کی بات پر یقین نہ آ رہا ہو۔
"میں اپنے باغ کے ہر درخت پر چڑھ سکتا ہوں۔"
"ہوں؟"
"میں — میں چنبیلی کے ہار بنا رہا ہوں۔ دیکھو!"
نیلا بولی — "ہم تم سے اچھے ہار بنا سکتے ہیں۔ ادھر دکھاؤ پھول۔"
رفیع نے نیلا کا ہاتھ پکڑا۔ اور اسے باڑ کے اس طرف لے آیا۔
پھر دونوں بیٹھ کر ہار بنانے لگے۔ ہار بناتے بناتے نیلا ہنسنے لگی۔ رفیع نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کیوں ہنستی ہو؟ کیا بات ہے؟"
نیلا ہنستے ہوئے کہنے لگی — "میں کہتی ہوں۔ تم ہار نہیں بنا سکتے۔ اور کیا؟"
رفیع کو جو غصہ آیا تو اس نے نیلا کے ایک طمانچہ لگا دیا۔
نیلا کہاں ہنس رہی تھی۔ کہاں اب زور زور سے رونے لگی
نیلا کو روتے دیکھ کر رفیع بہت پریشان ہوا۔ کیا کرے، کیا نہ

کرے۔ اگر امّی کو پتہ لگ گیا کہ اس نے نیلا کے طمانچہ لگایا ہے تو پٹ جائے گا۔ چنانچہ وہ نیلا کی منتیں کرنے لگا۔

"اچھا نیلا جانے دو۔ مت روؤ۔ میں کہتا ہوں مت روؤ۔ دیکھو میرے پاس تیتریوں کے تین سَو پر ہیں۔ میں وہ سب تمہیں دے دُوں گا۔ لو اب تم نہ روؤ۔ میں تمہیں ابھی لا کر دیتا ہوں۔"

رفیع دوڑتا دوڑتا گھر گیا اور تیتری کے پر والا ڈبا لے آیا۔ اور اسے کھول کر نیلا کے سامنے رکھ دیا۔ کتنے اچھے پر ہیں۔ یہ دیکھو، دیکھو نا نیلا، مت روؤ۔ اور یہ سب پھول اور ہار بھی تم رکھو۔

رفیع نے ایک ہار اُٹھا کر نیلا کے گلے میں پہنا دیئے۔

نیلا روتے روتے ہنسنے لگی۔

اُس دن سے نیلا اور رفیع اکٹھے کھیلتے رہے۔ اُنہوں نے جھاڑیوں سے بیر چن چن کر کھائے۔ انگور کی بیلوں پر چڑھ کر سونے کی طرح چمکنے والے انگوروں کے خوشے توڑے۔ نیلا کے گھر میں اخروٹ کے درخت کے سائے تلے بیٹھ کر "قاضی کو لٹا" اور بچپن کے دوسرے محبوب و مرغوب کھیل کھیلے۔ وہ ندی کے کنارے جا کر گڈریوں کے ساتھ ناچے۔ پینگیں بڑھائیں۔ بانسریوں کے گیت سنے کبھی کبھی رفیع دولہا بنتا تھا اور نیلا دلہن۔ اور گھاٹی کے دامن میں ننھے ننھے گڈریئے براتی بنے ہوئے، شور مچاتے ہوئے، کاغذ کی ڈفلیاں بجاتے ہوئے بھاگتے پھرتے تھے۔ ایک عجیب نظارہ ہوتا

تھا۔ اور جب کبھی نیلا کھیل ہی کھیل میں شوخی یا شرارت سے کسی دوسرے
گڈریئے کی دلہن بن جانے پر آمادگی ظاہر کرتی۔ تو رفیع بگڑ کھڑا
ہوتا۔ اور کھیل میں حصہ لینے سے انکار کر دیتا۔ اور لڑائی پر تل جاتا۔
یا نیلا سے روٹھ جاتا۔ روٹھے ہوئے منانے کے لئے نیلا کو کیسی
کیسی منتیں کرنی پڑتی تھیں۔ اور بہت سخت سخت قسمیں کھانی پڑتی تھیں۔

اس طرح تین سال گذر گئے۔ اس خوبصورت وادی میں ننھے دل
نے پاک اور معصوم محبت کا ایک میٹھا، سہانا اور پیارا سپنا دیکھا۔
وہ سپنا جو پہاڑی جھرنوں کے گیتوں کی طرح دلفریب تھا (وہ محبت
جو ستاروں کی طرح روشن اور بلند تھی) پھر یکایک رفیع کے والد کی
تبدیلی کسی اور جگہ ہو گئی۔ اور رفیع اور نیلا نے دھڑکتے ہوئے
دلوں اور ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کو الوداع کہا۔ رفیع
نے جاتے وقت وہ چیز بھی نیلا کو دیدی جسے وہ (اپنی جان سے بھی
عزیز رکھتا تھا) یہ ایک چاقو تھا جس کا پھل بہت تیز اور چمکدار تھا۔
اور دستے پر رنگ برنگ کے سیپ لگے ہوئے تھے۔ اور نیلا؟...
...نیلا نے بھی اپنے سبز منکوں کی مالا جسے وہ ہر وقت اپنے گلے میں
پہنے رکھتی تھی، اتار کر رفیع کو دیدی اور یہ سب کچھ چھپ چھپا کر ہوا۔
لیکن ٹھیک اس وقت جب رفیع کے گھر کے لوگ روانہ ہونے کو تھے۔
اور رفیع کو ایک گھوڑے پر سوار کیا جا رہا تھا۔ نیلا سسکیاں لیتی
ہوئی رو پڑی (رفیع کا دل بے تاب ہو گیا۔ لیکن اس وقت اس نے

نہایت ہمت سے کام لے کر اپنے آنسو روک لئے اور منہ پھیر کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں سفید سفید بادل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے جا رہے تھے۔

....

تیرہ سال اور گذر گئے۔ اور پھر ایک بار رفیع کے ابا کی تبدیلی اسی حسین وادی میں ہوئی جہاں نیلا رہتی تھی۔ رفیع کے دل میں بچپن کے خواب جاگ اُٹھے۔ اور اس عہد کی معصوم خوشیاں اور اس زریں زمانے کی تمنائیں دل میں کروٹیں لینے لگیں۔ کیا وہ نیلا کو بھول گیا تھا؟ کیا کالج کی ہنگامہ خیز زندگی نے اُس کے دل پر بچپن کا کوئی بھی نقش باقی نہ رہنے دیا تھا؟ کیا اب بھی وہ نیلا کو اسی طرح چاہتا تھا؟ اِن سب باتوں کا جواب شاید رفیع بھی اچھی طرح سے نہ دے سکتا تھا۔ ہاں شاید وہ نیلا کو قریباً بھول ہی گیا تھا۔ لیکن بالکل نہیں۔ وہ سبز منکوں کی مالا ابھی تک اِس کے پاس تھی۔ اور کسی قیمت پر بھی اِس سے اپنے آپ کو جدا نہ کر سکتا تھا۔

کالج کے پُر مسرت لمحوں میں بھی اُس نے اکثر نیلا کو یاد کیا۔ لیکن یوں ہی کبھی وہ اپنے بچپن کے دلکش کھیلوں کو یاد کر کے مسکرا دیتا۔ عجیب زمانہ تھا۔ نہ ہاکی نہ فٹ بال، نہ ٹینس۔ پھر بھی کتنی مسرت تھی اِن کھیلوں میں۔ اور نیلا وہ ننھی سی شوخ گڑیا تتلا کر باتیں کرتی ہوئی، ایک عجیب دلکش ادا سے ہنستی ہوئی۔

لیکن اب جب گرمیوں کی چھٹیوں میں اُس نے گھر آکر نیلا کو دیکھا۔ تو حیران رہ گیا آخری بار جب اُس نے نیلا کو دیکھا تھا تو وہ ایک ننھی سی بچی تھی جو اِس کی طرف دیکھ دیکھ کر روتی جاتی تھی۔ اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے آنسو پونچھتی جاتی تھی۔ پھر تیرہ سال تک اُسکے تخیل میں نیلا کی یہی تصویر رہی۔ وہ خود لڑکپن سے شباب میں آگیا۔ اُسکے والد کے سر کے بال سفید ہو گئے۔ باغ میں ناشپاتیوں کے وہ درخت جو آج سے تیرہ سال پہلے نہایت پتلے اور چھوٹے تنوں کے پودے تھے۔ آج اپنی شاخیں آسمان کی طرف بلند کئے کھڑے تھے۔ اور نیلا ..... وہ ننھی سی گڑیا؟

لیکن جلد ہی وہ نیلا کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ باغ میں ایک سیب کے درخت کے نیچے کتاب کھولے بیٹھا تھا۔ کہ کوئی اُس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ یہ نیلا ہی تھی۔ سرو کی طرح بلند قامت، شباب کی رعنائیوں کا مُرقع جمیل۔ اُس کے لبوں پہ ایک معصوم سی مُسکراہٹ تھی، جو شاید سورج کی کرنوں سے مل کر بنی تھی۔ اِس کی گود میں ایک ہنستا ہوا بچہ تھا۔

رفیع اُٹھ کھڑا ہوا۔

نیلا بولی۔ "تم نے مجھے پہچانا بھیا؟"

رفیع کے منہ سے نکلا۔ "نیلا؟"

نیلا ہنسنے لگی۔ وہی دلکش ہنسی۔ بچہ رفیع کو دیکھ کر کلکاریاں

مارنے اور زور زور سے بازو ہلانے لگا۔

رفیع نے آگے بڑھ کر اور بچے کے شانوں کو چھو کر کہا۔ "یہ تمہارا لڑکا ہے۔ کتنا خوبصورت ہے۔ اِس کا نام کیا ہے؟" نیلا نے کانپتی ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا۔ "ہاں اِس کا نام ہے رچھی، محمد رچھی۔"

کتنی ہی دیر رفیع خاموش کھڑا رہا۔ نہ اُس کے پاؤں تلے زمین تھی اور نہ سر پہ آسمان۔ وُہ خلا میں گھوم رہا تھا۔ نہایت تیزی سے گھوم رہا تھا۔ پھر یکایک ایک جھٹکے کے ساتھ وُہ بچپن کی زندگی میں لوٹ آیا۔ وُہ چھوٹا سا تھا۔ ننھا رفیع اور نیلا کے ساتھ بھاگ بھاگ کر تیتریاں پکڑ رہا تھا۔ نیلا اور وُہ سُنبلو کی شاخوں پر جھکے سُنبلو کھا رہے تھے۔ ندی کے کنارے اُونچے تنگ پر جھولا جھول رہے تھے۔ گڈریئے بانسریاں بجا رہے تھے۔ گڈریئے براتی بنے ہوئے تھے اور نیلا اُس کی دُلہن۔

بچے نے رفیع کے چہرے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ با.... با.... با.... با.....

رفیع بچے کی طرف جھکا۔ پھر اُس نے آہستہ سے اپنی جیب کے اندر سے کوئی چیز نکالی۔ یہ سبز موتیوں کی ایک مالا تھی۔ آہستہ سے اُس نے یہ مالا بچے کے گلے میں ڈال دی۔

نیلا کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے لیکن رفیع نے نہائیت

ہمت سے کام لیکر اپنے آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں روک لیا۔ اور نگاہیں اُٹھا کر گھاٹی سے اُوپر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں سفید سفید چمکتے ہُوئے بادل ایک دُوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے جا رہے تھے ؛

گلُ فروش

گُلفروش

جب گُل فروش کا بیٹا میٹرک پاس کر چکا تو بوڑھے باپ نے بیٹے کے ہاتھ میں ایک سائیکل دے کر یوں کہا۔ "جا بیٹا! نوکری تلاش کر۔" بالکل اسی طرح جیسے قرونِ وسطیٰ کا ناول نویس اپنے قصے کے ہیرو کو اپنی محبوبہ کی تلاش میں کسی بے آب و گیاہ خطۂ صحرائی میں چھوڑ دیتا ہے۔ چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی۔ بے چارے لڑکے کے سائیکل چلاتے چلاتے ٹخنے زخمی ہو گئے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں۔ وہ معصوم پھول سا چہرہ کمہلا گیا۔ مگر نوکری کہیں نہ ملی۔ گوہرِ مقصود ہاتھ نہ آیا پر نہ آیا۔

آخر ہار مان کر اور سائیکل کا ہینڈل توڑ کر گُل فروش کے بیٹے نے اپنے بوڑھے باپ سے کہا۔ "ابا! نوکری ملنا کچھ آسان نہیں۔ یہاں

تو اِس کے لئے بڑے بڑے مارے مارے پھرتے ہیں۔ میں غریب.....
کیا کر دوں؟"

بوڑھے باپ نے چلم پر سے راکھ جھاڑی اور رُک رُک کر بولا۔
"کرنا کیا ہے؟ دُکان پر بیٹھ جا...... گُل فروش کا بیٹا بھی گُل فروش ہے...... پھول بیچ اور گزارہ کر....... مولوی ٹھیک کہتا تھا۔ اِس لونڈے کو انگریزی کیوں پڑھاتے ہو۔ لمبے لمبے بال رکھے گا۔ اور عورتوں کی طرح مانگ نکالے گا۔ کل سے یہ زُلفیں کٹا دے اور ہار بنا!...... سُنا تُو نے؟"

اِتنا کہنے کے پانچ سال بعد بوڑھا گُل فروش راہیٔ عدم ہُوا۔

....

بوڑھے باپ کے مرنے پر گُل فروش نے اپنی دُکان انارکلی کے سرے پر کر لی۔ انگریزی تعلیم نے اُسے جِدّت پسند بنا دیا تھا۔ اُس نے ہار اور گجروں کے نئے نئے نمونے ایجاد کیے اور مشہور و معروف فلم ایکٹرسوں پر اُن کے نام رکھے۔ گوہر آبدار، گجن ادا، گُلِ گلزار، سلوچنا ہار وغیرہ۔ اور بھی کتنے ہی دِل رُبا اور دِل کش نمونے تھے جو تعلیم یافتہ طبقوں میں مقبول ہُوئے۔ اِس کی دُکان بہت چمک اُٹھی۔ اب اُس نے ہاتھ بٹانے کے لئے دو تین مُلازم بھی رکھ لئے۔ ریڈیو بھی لگا دیا۔ اخباروں میں اِشتہار بھی دینے لگا چند نمونے مُلاحظہ ہوں۔

نرگس کا سیزن ..... آگیا ہے۔
ہماری دکان پر تشریف لاکر نرگسی ہاروں کے "اپ ٹو ڈیٹ" ڈیزائن ملاحظہ فرمایئے۔

....

گربیٹا گاربو کی نئی پکچر کی تقریب پر گل گاربو کے گجرے پہنیئے اور پہنایئے۔

....

پھولوں کے خوشنما آویزے آپ کے حسن کے بہترین معاون ہیں۔

....

پردے کا خاص انتظام ہے۔

....

گل فروش کی مساعیٔ جمیلہ کا نتیجہ نہایت خوشگوار نکلا۔ ہار، گجرے وغیرہ پہننے کا پرانا دستور ہندوستانی سوسائیٹی میں از سرِ نو زندہ ہو گیا۔ پہلے تو تہواروں پر بھی لوگ ہار کم پہنتے تھے مگر اب کلرک، بابو، منشی لوگ دفتر بھی پھول لے کر جانے لگے۔ چنانچہ سیاہی سے گندی میزیں اور قلمدان پھولوں سے سج گئے۔ دفتر گلستان بن گئے۔ ہر طرف ایک مہک سی اڑی پھرتی تھی۔ کالج کے طلبا تو ہاروں کے اس قدر شیدائی ہوئے کہ پھولوں کے ہار بھی اپنی ٹائی یا سوٹ کے رنگ کی مناسبت سے چننے لگے۔ عورتوں اور پھولوں کا میل تو یوں بھی آنکھوں کو

بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اب تو انتہا ہی ہو گئی۔ اگر ایک خاتون
سراپا "نرگس" بنی ہوئی جا رہی ہے تو دوسری "موتیا کی ڈالی"۔ ایک
زعفران زار تھی۔ تو دوسری دھان کا کھیت جس کی بھینی بھینی
خوشبو اور خوشنما ہریاول آنکھوں کو طراوت بخشتی تھی۔ ہونے کو تو
یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن ہندوستان کی ان قدیم روایات کو تازہ کرنے
والے کا دل ہمیشہ غمگین و محزون ہی رہا۔ نوجوان گل فروش یہی سوچا
کرتا کہ اگر وہ پھول نہ بیچتا ہوتا تو اس وقت کم از کم بی۔اے۔ پاس
کر لیتا۔ اور پھر اس کو "نوکری" کہیں مل ہی جاتی —— اور پھر
اس کی شادی بھی کسی تعلیم یافتہ حسین لڑکی سے ہو جاتی۔ اور یہ بالکل
اغلب تھا۔ لیکن ..... اب ..... اب، وہ لمبے سانس بھرتے ہوئے
سوچتا۔ اب اس کی زندگی اس پھولوں کی دکان پر ریڈیمن کر اور
گجرے بیچ کر برباد ہو گئی تھی۔ اب وہ محض ایک ویران، شکستہ،
"کھنڈراتی" زندگی کا مالک رہ گیا تھا۔ آثارِ قدیمہ کے محکمے کی طرح، تعلیم یافتہ
لڑکی تو اس کے طبقے میں دو ہزار نمبروں والا بجلی کا قمقمہ لے کر ڈھونڈنے
پر بھی دستیاب نہ ہو سکتی تھی۔ اور جو لوگ اپنی لڑکیاں سکولوں اور کالجوں
میں پڑھاتے تھے، غالباً ان کا یہ منشا ہرگز نہ تھا کہ ان کی لڑکی
کسی پھول بیچنے والے کے پلّے باندھ دی جائے۔ وہ سماج کا اچھوت
تھا، ہری جن ..... ہری جن ..... اب ان اونچے طبقے والے
لوگوں نے ایک نیا لفظ اسی پرانے خیال کو ادا کرنے کیلئے اختراع

کیا ہے۔ کچھ بھی ہو وہ اپنی زندگی ایک اُجڈ اور پھوہڑ بیوی کے ساتھ نہیں بسر کر سکتا۔ جسے نہ تو باڈیس پہننے کا سلیقہ ہے نہ ساڑھی باندھنے کا قرینہ اور نہ اخبار پڑھنے کی عادت۔ جو تمام دِن اپنا سر چولھے میں دیئے رکھتی ہو۔ اُسے ...... وہ کسی عورت سے شادی کرنے کا خواہشمند تھا۔ ایک ورجن سے نہیں! لیکن اِس کے باوجود وہ دیگر امور میں ایک سادہ مزاج جوان سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً وہ اپنی بوڑھی ماں کی بہت عزّت کیا کرتا تھا۔ اور گو یہ بڑی حیرت کی بات ہے۔ پھر بھی یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اُسے اپنے ننھے بھائی سے بہت محبت تھی اور گو وہ ریشم کی خوبصورت قمیضیں پہنتا تھا جس پر لمبی لمبی خوش رنگ دھاریاں ہوتیں۔ اور عطر پھلیل لگاتا تھا۔ پھر بھی اُسے شراب، سگریٹ اور رنڈیوں سے بہت نفرت تھی۔ سنیما تھئیٹر دیکھنے پر بھی اُس کے چال چلن میں کچھ فرق نہ آیا۔ اُس کے دوست اکثر اِس پر تعجب کا اظہار کیا کرتے۔ آخر ایک پھول بیچنے والا کیونکر شریف رہ سکتا ہے؟

اِس کی بوڑھی ماں کو بھی یہی شک تھا۔ یوں تو وہ اِس پر جان چھڑکتی تھی۔ مگر ڈرتی تھی کہ کہیں اِس کا انٹرنس پاس بیٹا، آوارہ نہ ہو جائے۔ جو نوجوان پھول بیچتا ہو اور سنیما دیکھتا ہو، اُس کے لئے شریف رہنا بہت مشکل ہے۔ آخر کب تک؟ اسی لئے بوڑھی ماں اُس کی شادی پر مُصر تھی۔ مگر نوجوان گُل فروش نہیں مانتا تھا۔ اُس کے ناتجربہ کار شاعرانہ دِل نے پڑھی لکھی لڑکی کی ایک خیالی حسین مورت

بنا رکھی تھی۔ وہ اسی کو پوجتا تھا اور اسی سے شادی کا خواہاں تھا۔ بس یہی جھگڑا تھا۔ ماں ایک میٹھی، نرم مزاج، دیہاتی بہو کے حق میں تھیں۔ اور اُن کی نگاہ اپنے ہی قبیلہ میں ایک تیوں سے رت غریب طبیعت لڑکی پر تھی۔ گل فروش اس کے برعکس ایک ساڑھی نواز سینما پسند تیتری کی تلاش میں تھا...... مگر آہ، یہ وہ تیتریاں تھیں جو اُس کے گلوں پر کبھی بیٹھنا پسند نہ کرتیں۔ کیا وہ سوسائٹی کا اچھوت نہ تھا...... محض ایک گل فروش!

....

ایک سنیچر کی دل کش شام کا ذکر ہے۔ اُس دن نشاط تھیٹر میں وکٹر میوگو کا لافانی شاہکار "لے مزرابلز" دکھایا جانیوالا تھا۔ اور گل فروش دُکان کو جلد بند کرنے اور وہاں جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ کہ اتنے میں ایک چھوٹی سی "مارس" گل فروش کی دکان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اُس میں ایک جوان لڑکی اور ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی تھیں۔ گل فروش دکان کی سیڑھیاں اُتر کر موٹر کے قریب گیا۔ اور بوڑھی عورت کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "میم صاحبہ کیا حکم ہے؟" اِس پر جوان لڑکی نے موٹر کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "ہمیں کچھ ہار اور گجرے چاہئیں۔"

"آیئے، دُکان کے اندر تشریف لایئے!"

لڑکی نے بہت سے ہار خریدے، بہت سے گجرے، چند ایک گلدستے۔

چلتے وقت کہنے لگی۔ "کل ہمارے ہاں ایک ڈانس ہے۔ بال روم کو سجانا ہوگا۔ کل اپنے آدمیوں کو ساتھ لے آؤ۔ کوئی چار بجے شام کو اور دو گھنٹوں میں کام ختم کر دو۔ ٹھیک ہے؟"

گُل فروش نے جواب میں سر جھکا دیا۔

جب وُہ موٹر میں بیٹھ چکی تو نوجوان گل فروش نے پھر جھک کر سلام کیا۔ اور انگریزی میں نوجوان لڑکی سے پُوچھا۔ "سرکار آپ کا پتہ؟"

لڑکی کی آنکھوں میں حیرت کی ایک خفیف سی جھلک، اُس کے لبوں پر ایک خفیف سی مُسکراہٹ نمودار ہُوئی۔ اُس نے گردن کو ایک طرف جھٹکا کر کہا۔

"۱۰، فلیش روڈ، پلیز۔"

نوجوان گلُ فروش نے چلتی ہُوئی موٹر کو جھک کر ایک فرشی سلام کیا۔ اور آہستہ سے کہا۔ "۱۰ فلیش روڈ پلیز۔"

اِس واقعے کے تین چار روز بعد گل فروش کی بُوڑھی ماں کو محسوس ہُوا کہ اُس کا بیٹا غیر معمولی طور پر اُداس ہے۔ وُہ نہ صرف کھانا کم کھانے لگا تھا۔ بلکہ اب وُہ اکثر کھانا کھاتے ہُوئے منٹوں ایک طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگتا تھا۔ ایک نوالہ مُنہ میں، دُوسرا ہاتھ میں لئے وُہ کچھ سوچنے لگتا۔ پھر کچھ یاد آجانے پر ایک آہِ سرد بھر کر جلد جلد نوالے اُٹھانے شروع کر دیتا۔ کبھی وُہ چمپا کی چاندنی جیسی حسین اور نازک کلیوں کو زرّیں تاروں میں پروتے ہُوئے یکایک رُک جاتا، مُسکراتا،

پھر فوراً ہی غمگین ہو جاتا۔ اُس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگتے۔ اور جب اُس کی ماں اِس سے دریافت کرتی، کیا بات ہے بیٹا تو وُہ اِس درد بھرے سوال کے جواب میں ایک کھسیانی سی ہنسی ہنس دیتا۔ اور کہتا۔ "کچھ بھی نہیں اماں!"

اور اماں دِل میں سوچتیں۔ "ضرور کسی لڑکی نے اِسکے دل کو موہ لیا ہے۔ یا اللہ وُہ کون ہو گی؟۔ میرے بیٹے کو کیا ہو گیا ہے؟

خود بیچارے گُل فروش کو بھی ٹھیک معلوم نہیں تھا کہ اُس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ وُہ ہر روز حسین عورتیں دیکھتا تھا۔ اُس نے ڈھیروں کے ہاتھوں میں گجرے پہنائے تھے، نازک اندام کلائیوں میں گجرے پہننے کے نئے نئے انداز سکھائے تھے، کتنی شوخ نگاہوں کے وار سہے تھے! ہزاروں متبسم لبوں سے شہد کی طرح میٹھی بولیاں سُنی تھیں، کسی کے گداز بازوؤں کے سڈول پن نے اُسے متاثر نہ کیا تھا۔ اور قوس قزحی ساڑھیوں کے خوشنما رنگ اُس کے معصوم دِل پر سے ہمیشہ ایک سائے کی طرح گذر جاتے تھے۔ لیکن اب یک لخت یہ کیا ہو گیا تھا ..... جب بال رُوم کو سجاتے وقت وُہ بھی اُس کے پاس آکر ایک دم کے لئے کھڑی ہو گئی تھی تو اُس کی آنکھیں کیوں جھپک سی گئی تھیں۔ سانس کیوں ایک لمحے کے لئے رُک گئی تھی۔ اور جب وسطی فانوس کو لمبے لمبے ہاروں سے مزین کرتے وقت اُس کی اُنگلیاں اُس ہاتھوں سے چھُو گئی تھیں تو اُس کی رگوں کا خُون کیوں ایک آتشی سیال بن گیا

تھا۔ اور پھر ...... اسے بال روم سجاتے دیکھ کر وہ ایک دم پیانو کی طرف چلی گئی تھی تو وہ کیوں بے تاب ہو گیا تھا۔ اور یہ کس قدر عجیب احساس تھا کہ اسے پیانو بجاتے ہوئے سُنکر اسے محسوس ہوا کہ کسی نے گویا اس کے دل کے تاروں پر اپنی انگلیاں رکھ دی ہیں۔ اور ان میں سے ایک رنگین و حزین نغمہ پیدا ہو گیا ہے۔

شاید یہی احساسِ محبّت تھا۔ وہ احساس جو عمر میں صرف ایک بار پیدا ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے گل فروش کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے اور اس نے جلدی سے ایک کونے میں جا کر اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے۔

....

اس امر کا صحیح اندازہ لگانا اگرچہ مشکل ہے۔ کہ لڑکی کے دل کے تاروں پر گل فروش کے جذبات نے غیر شعوری طور پر کیا اثرات پیدا کئے۔ مگر یہ کہنے میں تو ذرا تامّل نہیں کہ اب وہ اکثر اس کی دکان پر آیا کرتی تھی لیکن اس کا مطلب یہ کیسے لیا جا سکتا ہے کہ وہ سب گل فروش سے محبت کرتی تھیں۔ پھولوں سے محبت کرنیکا طریقہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ باغ کے اُجڈ مالی سے محبت کی پینگیں بڑھائی جائیں۔ ایسی حماقت کون کرے گا؟ اور صنفِ نازک تو ایسے معاملوں میں ہمیشہ مردوں کے مقابلہ میں زیادہ دانشمندی کا ثبوت دیتی ہے۔ کون کہتا ہے کہ گل فروش کبھی عقلمند نہ تھا۔ مگر اب تو نہ جانے اس کی عقل پہ کیا پردہ پڑ گیا تھا کہ جب وہ سفید ساڑھی باندھے ہوئے دکان میں داخل ہوتی اس کا دل خوشی کے

مارے زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ وہ سمجھتا کہ وہ خفیف سی مسکراہٹ
جو اس کے رنگین لبوں پر کبھی کبھی آجاتی تھی صرف اسی کے لئے تھی
اُس کی صندلی کلائیوں میں پڑی ہوئی نقرئی چوڑیوں کی میٹھی چھنچھناہٹ
اسی کے کانوں کے لئے پیدا ہوتی تھی۔ اور سفید ساڑھی میں چھپے ہوئے
کانوں میں گلاب کے پھولوں کے جھلملاتے ہوئے سُرخ سُرخ آویزے شاید
اسی کی حریص نگاہوں کے لئے پہنے جاتے تھے۔ شاید؟ ...... وہ کبھی
کبھی خیال کر لیتا کہ وہ یقیناً اس سے محبت کرتی ہے۔ کبھی کسی اندھیری
رات میں جب کوئی اُسے دیکھ نہ سکے۔ اس کی کوٹھی کے گرد چکر لگاتا۔
اور مغربی سمت کے ایک کمرے میں روشنی دیکھ کر خوش ہوتا۔ اور پھر
جب کبھی ایک چھریرا سا سایہ اس روشنی کے ایک طرف سے ہو کر دوسری
طرف کو گذر جاتا تو اُس کے دل کی حرکت یکبارگی تیز ہو جاتی۔ اور وہ
یکایک بجلی کے کھمبے کا سہارا لینے کی ضرورت محسوس کرتا۔ پھر وہ دیر تک
کھڑکی کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہتا۔ حتیٰ کہ روشنی بجھ جاتی اور اُس
کے دل میں ایک اندھیرا سا چھا جاتا اور وہ اُس گھبرائے ہوئے مسافر کی طرح
جو اپنا راستہ بھول گیا ہو گھر کی راہ لیتا۔

اور اماں بیچاری دل میں روز کڑھتیں، ہائے اللہ، میرے بیٹے کو کیا
ہو گیا ہے؟ رات دن کس فکر میں غلطاں رہتا ہے۔ کہیں کسی کی نظر تو نہیں
لگ گئی۔ کوئی آسیب؟ ...... پھر یکایک اپنے منہ پہ ہاتھ رکھ لیتی اور
سر جھکا کر چادر کاڑھنے لگتی۔

اِسی طرح چھ مہینے گذر گئے۔

....

ایک ابر آلود شام کو وُہی موٹر جب آئی تو گُل فروش نے دیکھا کہ بُوڑھی عورت اکیلی بیٹھی ہے۔ گلفروش کے جُھک کر سلام کرنے پر بُوڑھی عورت نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔ "کل دِن کو بہت سے پھُول اور ہار وغیرہ درکار ہوں گے۔ اور رات کو کوٹھی بھی سج جا.........."

بہت اچھا سرکار، گُل فروش نے یہ کہکر ایک تیز نگاہ موٹر کی خالی سیٹ پر ڈالی۔

بُوڑھی عورت نے پھر مُسکرا کر کہا۔ "کل مس ہرمز جی کی شادی ہے نا۔ بہت سے پھُول چاہیئں۔"

موٹر چل دی۔ غریب گُل فروش سر جھکائے رہ گیا۔

....

دُوسرے دِن گُل فروش کو ایسا معلُوم ہُوا۔ کہ اُسے ہلکا سا بُخار ہے اُس کا سر گھُوم رہا تھا۔ مگر اُسے آج تو بہت کام کرنا تھا۔ وُہ بہت سویرے اُٹھا اور دُکان پر کام کرنے چلا گیا۔ آج وُہ نہایت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اُس کی محبوبہ کی شادی تھی! آج اُس نے وُہ وُہ خُوبصورت ہار اور گجرے تیار کئے جو اِس سے پہلے کبھی نہ کئے تھے۔ آج اُس کی محبوبہ کی شادی تھی!! اُس نے پھُولوں کو زرّیں تاروں میں اُلجھا کر نازک چادریں بنائیں۔ حسین گلدستے، کلیوں کے چندن ہار تیار کئے اور موتیا

کے نیم وا پھولوں سے ایک خوبصورت مکٹ تیار کیا۔ آج اس کی محبوبہ کی شادی تھی!!!

گُل فروش نے کوٹھی کا کونا کونا پھولوں سے سجا دیا۔ وُہ آج نہایت انہماک سے کام کر رہا تھا۔ کبھی اِدھر، کبھی اُدھر بھاگا پھر رہا تھا۔ اپنے مُلازموں کو ہدایت دیتا جاتا تھا۔ کبھی اِدھر، کبھی اُدھر بھاگا پھر رہا تھا۔ اپنے ملازموں کو ہدایت دیتا جاتا تھا۔ کتنی گہما گہمی، کتنی رونق تھی!

بُڈھی عورت مُسکراتی ہُوئی اُدھر سے نکل جاتی اور ایک سفید داڑھی والا گوری رنگت کا آدمی پہیّوں والی آرام کُرسی میں بیٹھا ہُوا کُرسی کے ہینڈل گھما کر اِدھر اُدھر دھکیلتا ٹٹولتے جا رہا تھا۔ ایک کمرے میں اُس نے اپنی محبُوبہ کو بھی دیکھا تھا۔ وُہ اپنے قبول صُورت بھائی کے پاس بیٹھی ہُوئی ...... جُھکی ہُوئی آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی۔ اور پھر وُہ دونوں آہستہ سے ہنس پڑے تھے۔ بھلا وُہ اِسے دیکھ کر گھبرا کر کیوں کھڑی ہو گئی تھی! ایک لمحہ ــــ صرف ایک لمحہ کے لئے گلفروش نے اِسے ملامت بار نگاہوں سے دیکھا۔ اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ کیا لڑکی کے نازک رنگین لب نرگس کی طرح زرد نہیں ہو گئے تھے۔ اور کیا گُل فروش نے واقعی اِس کی نگاہ کی خطاوار یاں دیکھ لی تھیں؟ شاید یہ اِس کا وہم ہی تھا۔ کیونکہ دُوسرے لمحہ ہی میں وُہ اپنے بھائی سے باتیں کرنے میں مشغول ہو گئی تھی۔

کام کرتے کرتے شام ہو گئی۔ آسمان پر تارے نکل آئے۔ کوٹھی میں برقی قمقمے روشن ہو گئے۔ آج دن بھر سے گل فروش بھوکا تھا بھوکا؟ نہیں، اسے بھوک لگی ہی نہ تھی۔ اب اس کا کام ختم ہو گیا تھا۔ کوٹھی سج چکی تھی۔ بینڈ بج رہا تھا۔ گل فروش باغ کے ایک کونے میں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ وہ کدھر جائے؟ اسے چاروں طرف اندھیرا نظر آ رہا تھا۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا...... وہ جانے سے پہلے اپنی محبوبہ کو ایک لمحہ کے لئے دیکھ لینا چاہتا تھا۔ اس نے ایک نیلے سے رومال میں موتیا کے پھولوں کا بنا ہوا مکٹ لپیٹ رکھا تھا۔ کاش وہ اپنے ہاتھوں سے یہ مکٹ اسے پہنا سکتا۔ اور پھر اس کے قدموں پر گر جاتا — بے وقوف گل فروش!

....

رات کے نو بجے فلیش روڈ سے موٹریں چلنا شروع ہوئیں۔ آگے آگے نوشہ کی کار تھی۔ پھولوں سے سجی ہوئی۔ اس میں دولہا اور دلہن بیٹھے تھے۔ اور اس کے پیچھے پیچھے بیس تیس موٹریں ہارن بجاتی ہوئی آ رہی تھیں۔ فلیش روڈ سے ڈنگلٹن روڈ تک تونے دیگوں کا بہت ہجوم تھا۔ بلند قہقہے اور ہارنوں کی دلخراش آوازیں، موٹروں کے انجنوں کی گڑگڑاہٹ اور کسی آوارہ کتے کا بھونکنا — خدا خدا کر کے جب ڈنگلٹن روڈ گزر گئی تو موٹروں نے تیز ہونا شروع کیا۔ اور جب فاپ روڈ آ گئی تو نوشاہ کی کار خوشی سے اُڑی جا رہی تھی۔ یہاں ایک خوشگوار سا اندھیرا تھا۔ بجلی کے کھمبے بھی دور دور تھے۔ اور دو رویہ گھنے درخت کھڑے تھے۔

یکایک نوشاہ کو سامنے سے ایک شخص بھاگتا ہوا نظر آیا۔ اُس کے بازو کھلے تھے۔ اور وہ عین موٹر کی سمت دوڑتا ہوا آرہا تھا۔ ڈرائیور نے زور سے ہارن بجایا۔ اور موٹر کو ایک طرف کرنا چاہا۔ اُس نے بریک بھی دبائی۔ مگر آہ یہ سب کچھ بہت دیر سے ہوا۔ وہ پاگل شخص موٹر کے نیچے آچکا تھا۔ اس کی چھاتی اور دائیں بازو سے خون بہہ رہا تھا۔

دُلھن ایک دل خراش چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔

نوشاہ اور موٹروں میں بیٹھے ہوئے اور لوگ کر بھی کیا سکتے تھے۔ اُسے اُٹھا کر اسی دم ہسپتال لے گئے۔ زخمی کو فی الفور آپریشن روم میں لیجایا گیا۔ باہر کمرے میں سب لوگ بیٹھے ہوئے سوچنے لگے۔ آہ بیچارے کو بہت چوٹ آئی ہے۔ وہ کیوں موٹر کے نیچے آگیا؟ کیا وہ بچ جائے گا؟ آخر ایک لمبے عرصے کے بعد ڈاکٹر باہر آیا اور نوشاہ سے کہنے لگا۔" آخری لمحوں پر ہے۔ تمہاری مسز کو بُلاتا ہے۔"

گل فروش میز پر لیٹا ہوا تھا۔ چھاتی پر پٹی بندھی تھی۔ جو خون سے سُرخ ہو چکی تھی۔ لڑکی کو دیکھ کر اُسکے زرد چہرے پر ایک ہلکی سی مُسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اِس نے لڑکی کی جانب اپنا داہنا ہاتھ بڑھایا۔ آہ! اِس ہاتھ کی لرزتی ہوئی اُنگلیوں نے اِسی موتیا کے مُکٹ کو تھام رکھا تھا۔ مُکٹ خون آلود تھا۔ پھول والے نے اپنے پھولوں کے ساتھ خون کی ہولی کھیلی تھی کس لئے؟ کیا اِس مُلاقات کے لئے؟ — بیوقوف گل فروش!

لڑکی نے ایک قلیل وقفہ کے لئے گل فروش کی طرف دیکھا۔ گل فروش کا سر اس کی چھاتی پر جھک گیا۔ اور لڑکی نے دونوں ہاتھ بڑھا کر گلفٹ کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ جیسے کوئی کسی معصوم یتیم بچے کو اپنی گود میں لے لے۔ گل فروش کا بازو آہستہ سے میز پر گر گیا۔ اس نے اپنی رُوح کی پوری قوت سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ شاید وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسم نمودار ہُوا۔ یہ چراغِ سحری کی جھلملاتی ہوئی لو تھی۔

گل فروش کا اُکھڑا ہُوا سانس مدھم پڑ گیا۔ ڈاکٹر نبض پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔ گل فروش کے لب کانپے۔ ہلکی ہلکی ایک دو ہچکیاں آئیں۔

چراغ بجھ گیا۔

لڑکی رونے لگی۔

"یہ کون تھا؟" ڈاکٹر نے آہستہ سے پُوچھا۔

کوئی اس کے نام سے واقف نہ تھا...... نوشاہ روتی ہوئی دلہن کو بازوؤں میں تھام کر باہر لے گیا

ڈاکٹر نے اپنے شانوں کو ایک خفیف سی حرکت دی۔ اور نرس سے بولا "دوسرا مریض لاؤ!"

دُنیا کے اس بھرے ہسپتال میں یہی ہوتا ہے۔ جب ایک مریض مر جاتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ فوراً آجاتا ہے۔

....

اس حادثے کے چند دِنوں بعد گُل فروش کا چھوٹا بھائی، اپنی دُکان پر (انارکلی کے سرے کے قریب) توتلی زبان میں گجرے اور پھُول بیچ رہا تھا - اور ایک چھوٹی سی لڑکی اپنے باپ کی اُنگلی پکڑے ہُوئے اِسے نہایت دِل آویز لہجے میں مجبُور کر رہی تھی۔ کہ وُہ اُسے ننھے گُل فروش کی دُکان سے چنبیلی کے پھُولوں کے دو ننھے آویزے لے دے ؛

دو فرلانگ لمبی سڑک

"دو فرلانگ لمبی سڑک"

کچہریوں سے لیکر لا کالج تک بس یہی کوئی دو فرلانگ لمبی سڑک ہوگی، ہر روز مجھے اسی سڑک پر سے گزرنا ہوتا ہے، کبھی پیدل کبھی سائیکل پر، سڑک کے دورویہ شیشم کے سوکھے سوکھے اداس سے درخت کھڑے ہیں۔ اِن میں نہ حسن ہے نہ چھاؤں، سخت کھردرے تنے اور ٹہنیوں پر گدھوں کے جھنڈ۔ سڑک صاف سیدھی اور سخت ہے۔ متواتر نو سال سے میں اس پر چل رہا ہوں۔ نہ اس میں کبھی کوئی گڑھا دیکھا ہے، نہ شگاف۔ سخت سخت پتھروں کو کوٹ کوٹ کر یہ سڑک تیار کی گئی ہے اور اب اس پر کول تار بھی بچھی ہے۔ جس کی عجیب سی بو گرمیوں میں طبیعت کو پریشان کر دیتی ہے۔

سڑکیں تو میں نے بہت دیکھی بھالی ہیں۔ لمبی لمبی، چوڑی چوڑی سڑکیں، برادے سے ڈھنپی ہوئی سڑکیں۔ سڑکیں جن پر سرخ بجری بچھی ہوئی تھی، سڑکیں جن کے گرد سرو شمشاد کے درخت کھڑے تھے، سڑکیں...... مگر نام گنانے سے کیا فائدہ۔ اس طرح تو ان گنت سڑکیں دیکھی ہونگی۔ لیکن جتنی اچھی طرح میں اس سڑک کو جانتا ہوں، کسی اپنے گہرے دوست کو بھی اتنی اچھی طرح نہیں جانتا۔ متواتر نو سال سے اسے جانتا ہوں۔ اور ہر صبح اپنے گھر سے جو کچہریوں کے قریب ہی ہے، اٹھ کر دفتر جاتا ہوں جو لا کالج کے پاس ہی ہے۔ بس یہی دو فرلانگ کی سڑک، ہر صبح اور ہر شام کچہریوں سے لیکر لا کالج کے آخری دروازے تک کبھی سائیکل پر۔ کبھی پیدل۔

اس کا رنگ کبھی نہیں بدلتا۔ اس کی ہیئت میں تبدیلی نہیں آتی۔ اس کی صورت میں ڈھکاپن بدستور موجود ہے۔ جیسے کہہ رہی ہو مجھے کسی کی پرواکیوں ہو؟ سینکڑوں ہزاروں انسان، گھوڑے گاڑیاں، موٹریں اس پر سے ہر روز گذر جاتی ہیں۔ اور پیچھے کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔ اس کی ہلکی نیلی اور سانولی سطح اسی طرح سخت اور سنگلاخ ہے جیسی پہلے روز تھی جب ایک یورپین ٹھیکیدار نے اسے بنایا تھا۔

یہ کیا سوچتی ہے؟ یا شاید یہ سوچتی ہی نہیں، میرے سامنے

ہی اِن نو برس میں اِس نے کیا کیا واقعات، حادثے دیکھے۔ ہر روز ہر لمحہ کیا کیا نئے تماشے نہیں دیکھتی۔ لیکن کسی نے اسے مسکراتے نہیں دیکھا۔ نہ روتے ہی۔ اِس کی پتھریلی چھاتی میں کبھی درد بھی پیدا نہیں ہوئی۔

"ہائے بابو، اندھے محتاج، غریب فقیر پر ترس کر جاؤ رے بابا، ا بابو، خدا کے لئے ایک پیسہ دیتے جاؤ رے بابا۔ ارے کوئی بھگوان کا پیارا نہیں۔ صاحب جی میرے ننھے ننھے بچے بلک رہے ہیں۔ ارے کوئی تو ترس کھاؤ اِن یتیموں پر۔"

بیسیوں گداگر اِسی سڑک کے کنارے بیٹھے رہتے ہیں۔ کوئی اندھا ہے تو کوئی لنجا۔ کسی کی ٹانگ پر ایک خطرناک زخم ہے۔ تو کوئی عورت دو تین چھوٹے چھوٹے بچے گود میں لئے حسرت بھری نگاہوں سے راہگیروں کی طرف دیکھتی جاتی ہے۔ کوئی پیسہ دے دیتا ہے کوئی تیوری چڑھائے گزر جاتا ہے۔ کوئی گالیاں دے رہا ہے۔ "حرام زادے، مشٹنڈے، کام نہیں کرتے۔ بھیک مانگتے ہیں۔"

کام، بیکاری، بھیک۔

دو لڑکے سائیکل پر سوار ہنستے ہوئے جا رہے ہیں۔ ایک بڈھا امیر آدمی اپنی شاندار فٹن میں بیٹھا سڑک پر بیٹھی ہوئی بھکارن کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اور اپنی انگلیوں سے مونچھوں کو تاؤ دے رہا ہے۔ ایک سست مضمحل کتا فٹن کے پہیوں تلے آگیا ہے۔ اِس کی پسلی

کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ لہو بہہ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کی افسردگی، بے چارگی۔ اس کی ہلکی ہلکی دردناک ہائے ہائے کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی۔ بوڑھا آدمی اب گدیلوں پر جھکا ہوا اس عورت کی طرف دیکھ رہا ہے جو ایک خوشنما سیاہ رنگ کی ساڑھی زیب تن کئے اپنے نوکر کے ساتھ مسکراتی ہوئی باتیں کرتی جا رہی ہے۔ اس کی سیاہ ساڑھی کا نقرئی حاشیہ بڈھے کی مریض آنکھوں میں چاند کی کرن کی طرح چمک رہا ہے۔

....

پھر کبھی سڑک سنسان ہوتی ہے۔ صرف ایک جگہ شیشم کے درخت کی چھدری چھاؤں میں ایک ٹانگے والا گھوڑے کو سستا رہا ہے۔ گدھ دھوپ میں ٹہنیوں پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔ پولیس کا سپاہی آتا ہے۔ ایک زور کی سیٹی، او تانگے والے یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے۔ کیا نام ہے تیرا، کر دوں چالان؟ ہجور، "ہجور کا بچہ!" چل تھانے ہجور؟ یہ تھوڑا ہے، اچھا جا تجھے معاف کیا۔

تانگے والا تانگے کو سرپٹ دوڑائے جا رہا ہے۔ راستے میں ایک "گورہ" آ رہا ہے۔ سر پر ٹیڑھی ٹوپی، ہاتھ میں بید کی چھڑی، رخساروں پر پسینہ۔ لبوں پر کسی ڈانس کا سُر۔

"کھڑا کر دو، کنٹونمنٹ۔"

"آٹھ آنے صاب۔"

"دو چھ آنے۔"

"نہیں صاب"

"کیا بکتا ہے، تم ...."

تانگے والے کو مارتے مارتے بید کی چھڑی ٹوٹ جاتی ہے۔ پھر تانگے والے کا چمڑے کا ہنٹر کام آتا ہے۔ لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں۔ پولیس کا سپاہی بھی پہنچ گیا ہے۔ حرامزادے، صاب بہادر سے معافی مانگو۔ تانگے والا اپنی میلی پگڑی کے گوشے سے آنسو پونچھ رہا ہے۔ لوگ منتشر ہو جاتے ہیں۔

اب سڑک پھر سنسان ہے۔

شام کے دھندلکے میں بجلی کے قمقمے روشن ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ کچہریوں کے قریب چند مزدور بال بکھرے، میلے کپڑے پہنے باتیں کر رہے ہیں۔

"بھیا بھرتی ہو گیا۔"

"ہاں۔"

"بڈھو کے لئے کما لائے گا۔ پہلی بیوی تو ایک ہی پھٹی ساڑھی میں رہتی تھی۔"

"سنا ہے، جنگ شروع ہونے والی ہے۔"

"کب شروع ہو گی؟"

"کب؟ اس کا تو پتہ نہیں مگر ہم غریب ہی تو مارے جائیں گے"

"کون جانے گریب مارے جائینگے کہ امیر۔"

"نتھا کیسا ہے؟"

"بخار نہیں ٹلتا، کیا کریں۔ اِدھر جیب میں پیسے نہیں ہیں۔ اُدھر حکیم سے دوا ـــــ"

"بھرتی ہو جاؤ۔"

"سوچ رہے ہیں۔"

"رام رام۔"

"پھٹی ہوئی دھوتیاں ننگے پاؤں، تھکے ہوئے قدم۔ یہ کیسے لوگ ہیں۔ یہ نہ تو آزادی چاہتے ہیں۔ نہ حریت۔ یہ کیسی عجیب باتیں ہیں۔ پیٹ، بھوک، بیماری، پیسے، حکیم کی دوا۔ جنگ۔ قمقموں کی زرد زرد روشنی سڑک پہ پڑ رہی ہے۔

دو عورتیں، ایک بوڑھی ایک جوان، اُپلوں کے ٹوکرے اُٹھائے خچروں کی طرح ہانپتی ہوئی گزر رہی ہیں۔ جوان عورت کی چال تیز ہے۔

"بیٹی، بیٹی، ذرا ٹھہر تو۔" بوڑھی عورت کے چہرے پر بے شمار جھریاں ہیں۔ اس کی چال مدھم ہے۔ اسکے لہجے میں بے کسی ہے۔

"بیٹی، بیٹی، ذرا ٹھہر۔ میں تھک گئی ..... میرے اللہ!"

"اماں، ابھی گھر جاکر روٹی پکانی ہے۔ تو تو باولی ہوئی ہے۔"

"اچھا بیٹی، اچھا بیٹی۔"

بوڑھی عورت جوان عورت کے پیچھے بھاگتی ہوئی جا رہی ہے۔ بوجھ کے مارے اُس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اُس کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں۔

وہ صدیوں سے اسی سڑک پر چل رہی ہے۔ اپنوں کا بوجھ اُٹھائے ہوئے، کوئی اُس کا بوجھ ہلکا نہیں کرتا۔ کوئی اسے ایک لمحہ ستانے نہیں دیتا۔ وہ بھاگی ہوئی جا رہی ہے۔ اُس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اُس کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں۔ اُس کی جھریوں میں غم ہے۔ اور بھوک اور دُکھ اور غلامی اور صدیوں کی غلامی!

تین چار نوخیز لڑکیاں بھڑکیلی ساڑھیاں پہنے، باہوں میں باہیں ڈالے ہوئے جا رہی ہیں۔

"بہن آج شملہ پہاڑی کی سیر کریں۔"

"بہن آج لارنس گارڈن چلیں۔"

"بہن آج انارکلی۔"

"ریگل۔"

"شٹ اپ یو فول۔"

. . . .

آج سڑک پر سُرخ خون بچھا ہے۔ اِدھر اُدھر جھنڈیاں لگی ہوئی ہیں۔ جا بجا پولیس کے سپاہی کھڑے ہیں۔ کوئی بڑے آدمی آ رہے ہیں۔ جبھی تو سکولوں کے چھوٹے چھوٹے لڑکے نیلی پگڑیاں باندھے سڑک پر دو رویہ قطاروں میں کھڑے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں

ہیں۔ اِن کے لبوں پر پپڑیاں جم گئی ہیں۔ اِن کے چہرے دُھوپ کی حِدت سے تمتما اُٹھے ہیں۔ اِسی طرح کھڑے کھڑے وُہ ڈیڑھ گھنٹے بڑے آدمی کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب وہ پہلے پہلے یہاں سڑک پر کھڑے ہوئے تھے تو ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ اب سب چُپ ہیں۔ چند لڑکے ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے تھے۔ اب اُستاد انہیں کان سے پکڑ کر اُٹھا رہے ہیں۔ شفیع کی پگڑی کھُل گئی تھی۔ اُستاد اُسے گھُور کر کہہ رہا ہے۔ "او شفی، پگڑی ٹھیک کر۔ پیارے لال کی شلوار اُس کے پاؤں میں اٹک گئی ہے اور ازار بند جوتیوں تک لٹک رہا ہے۔" "تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے پیارے لال!"

"ماسٹر جی۔ پانی۔"

پانی کہاں سے لاؤں۔ یہ بھی تم نے اپنا گھر سمجھ رکھا ہے۔ دو تین منٹ اور انتظار کرو۔ بس ابھی جھنڈی ہوا چاہتی ہے۔

دو منٹ، تین منٹ، آدھا گھنٹہ۔

ماسٹر جی، پانی۔

ماسٹر جی، پانی۔

ماسٹر جی بڑی پیاس لگی ہے۔

لیکن اُستاد اب اِس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے وُہ اِدھر اُدھر دوڑے پھر رہے ہیں۔ لڑکو ہوشیار ہو جاؤ۔ دیکھو جھنڈیاں اِس طرح ہلانا۔ اب تیری جھنڈی کہاں ہے؟ قطار سے باہر ہو جا، بدمعاش کہیں کا.....

سواری آ رہی ہے۔

موٹر سائیکلوں کی پھٹ پھٹ، بینڈ کا شور، پتلی اور چھوٹی جھنڈیاں بے دلی سے ہلتی ہوئی۔ سوکھے ہوئے گلوں سے پژمردہ نعرے۔

بڑا آدمی سڑک سے گزر گیا۔ لڑکوں کی جان میں جان آ گئی ہے۔ اب وہ اچھل اچھل کر جھنڈیاں توڑ رہے ہیں۔ شور مچا رہے ہیں۔

خوانچے والوں کی صدائیں، ریوڑیاں، گرم گرم چنے، حلوا پوری، نان کباب۔

ایک خوانچے والا ایک کُرتے والے بابو سے جھگڑ رہا ہے۔ مگر آپ نے میرا خوانچہ الٹ دیا۔ میں آپ کو نہیں جانے دوں گا۔ میرا تین روپے کا نقصان ہو گیا۔ میں غریب آدمی ہوں۔ میرا نقصان پورا کر دیجیے تو میں جانے دوں گا۔

....

....

صبح کی ہلکی ہلکی روشنی میں بھنگی سڑک پر جھاڑو دے رہا ہے۔ اس کے منہ اور ناک پر کپڑا بندھا ہے۔ جیسے بیلوں کے منہ پر جب وہ کولھو چلاتے ہیں۔ وہ گرد و غبار میں اٹا ہوا ہے اور جھاڑو دیے جا رہا ہے۔

میونسپلٹی کا پانی والا چھکڑا آہستہ آہستہ سڑک پر چھڑکاؤ کر رہا ہے۔ چھکڑے کے آگے جتے ہوئے دو بیلوں کی گردنوں پر زخم پیدا ہو گئے ہیں۔ چھکڑے والا سردی سے ٹھٹھرتا ہوا کوئی گیت گانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بیلوں کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ابھی سڑک کا کتنا حصہ باقی ہے۔

سڑک کے کنارے ایک بڈھا گداگر پڑا ہے۔ اس کے میلے دانت ہونٹوں

کے اندر دھنس گئے ہیں۔ اس کی کھلی ہوئی بے نور آنکھیں آسمان کی طرف تک رہی ہیں۔

خدا کے لئے مجھ غریب پر ترس کھا جاؤ رے بابا۔

کوئی کسی پر ترس نہیں کھاتا۔ سڑک خاموش اور سنسان ہے۔ یہ سب کچھ دیکھتی ہے۔ سنتی ہے۔ مگر ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ انسان کے دل کی طرح بے رحم، بے حس اور وحشی ہے۔

انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں اکثر میں سوچتا ہوں کہ اگر اسے ڈائنامیٹ لگا کر اڑا دیا جائے تو پھر کیا ہو۔ ایک بلند دھماکے کے ساتھ اس کے ٹکڑے فضا میں پرواز کرتے نظر آئیں گے۔ اُس وقت مجھے کتنی مسرت حاصل ہوگی۔ اس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ کبھی کبھی اس کی سطح پر چلتے چلتے میں پاگل سا ہو جاتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ اسی دم کپڑے پھاڑ کر ننگا سڑک پر ناچنے لگوں۔ اور چلا چلا کر کہوں میں انسان نہیں ہوں۔ میں پاگل ہوں۔ مجھے انسانوں سے نفرت ہے۔ مجھے پاگل خانے کی غلام گردشیں بخش دو۔ میں ان سڑکوں کی آزادی نہیں چاہتا۔

. . . .

سڑک خاموش ہے اور سنسان۔ بلند ٹہنیوں پر گدھ بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔

یہ دو فرلانگ لمبی سڑک!

بندوالی

"بند والی"

وُہ دھان کُوٹنے والی تھی اور بند کے آس پاس رہتی تھی۔ مَیں اِسی ہاؤس بوٹ کی چھت پر بیٹھ کر اِسے دیکھا کرتا تھا۔ اِس واقعہ کو کم و بیش تین سال کا عرصہ گزر چُکا ہے۔ اور ہم بڑے بھائی جان اور بھابی جان پہلی دفعہ سرینگر آئے تھے۔ ڈاکٹروں نے بھابی جان کے خُون کا دباؤ خطرناک طور پر زیادہ بتایا تھا اور گرمیوں میں کشمیر جانے کا مشورہ دیا تھا۔ ہمیں یہاں آئے تقریباً ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ مگر اب تک مَیں اِس کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔ ہر روز اِسے چھت پر سے دیکھتا تھا۔ اور ہر روز اِسے دھان کُوٹنے میں مصرُوف پاتا۔ مگر اِس مصروفیت کے باوجود ہماری آنکھیں چار ہو ہی جایا کرتی تھیں۔ کشمیری حُسن یوں بھی تو بہُت مشہُور ہے۔ مگر اِس لڑکی میں ایسی عجیب دِل کشی، بانکپن اور دِل آویزی تھی کہ

کچھ بیان ہی نہیں کر سکتا۔ یوں تو اس کے ہاتھ اور ٹخنے عموماً میلے ہوتے تھے اور لباس بھی بوسیدہ اور جا بجا سے تار تار۔ لیکن اس کے بے داغ حسن کی فراوانی نے افلاس کی کم مائگی اور بیچارگی کو ڈھانپ لیا تھا۔ اس کے حسن میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ میرا دل بے اختیار اس کی طرف کھچا چلا جاتا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ میں ہی اسے ہر وقت دیکھتا تھا۔ وہ بھی کبھی وقت جب میں کوئی ناول پڑھنے میں مشغول ہوتا یا غروبِ آفتاب کے وقت دریا میں تیرتے ہوئے شکاروں کی طرف دیکھ رہا ہوتا۔ میری طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ لیا کرتی۔ اور پھر جب یکایک۔ ہماری نگاہیں ایک دوسرے سے ملتیں تو وہ کسی قدر شرما جاتی۔ اٹھا ہوا موسل آہستہ سے اوکھلی میں گر جاتا۔ اور لانبی لانبی پلکیں شرمگیں رخساروں کو چھو جاتیں۔ ہر روز اسی طرح نظارہ بازی ہوتی تھی۔ میں خوش تھا۔ اور دل میں سمجھتا تھا کہ اس راز سے اور کوئی آگاہ نہیں۔ اس لئے ایک روز مجھے بہت حیرانی ہوئی جب میرے نوکر رمضان نے مجھے آ کر سنایا کہ بھابی جان پوچھتی تھیں کہ یہ سامنے بند والی لڑکی ہر وقت اوپر کیوں دیکھتی رہتی ہے ..... اور یہ کہہ کر کم بخت مسکرانے لگا۔ معلوم نہیں سچ کہتا تھا۔ یا جھوٹ۔ مگر مجھے بھابی جان سے پوچھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

ایک شام کا ذکر ہے۔ میں سیر سے واپس آ رہا تھا کہ بند کے اس طرف جہاں خیالاں اور شاہ بلوط کے بڑے بڑے گھنے اور قد آور درخت کھڑے تھے، وہ مجھے یکایک مل گئی۔ اور مجھے دیکھتے ہی ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

خوب بنی ٹھنی تھی۔ ایک تنگ نیلے رنگ کا پیراہن پہنے تھی۔ جو اس کے تناسب اعضا کو اچھی طرح کی اچھی طرح ظاہر کر رہا تھا۔ چہرہ تو نظر نہیں آ سکتا تھا لیکن ہاتھ آج غیر معمولی طور پر صاف تھے اور بے داغ۔ دودھ جیسی سپید گردن میں لڑیوں کی پہنے ہوئے، سرخ منکے نہایت بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ سرخ سپید رخسار چمک رہے تھے۔ اور ان آنکھوں کی نیلی گہرائیوں کو کیا کہوں۔ نہیں دیکھ کر ڈل پر کھلے ہوئے کنول کے پھول یاد آ جاتے ہیں۔

— میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور مسکرا کر پوچھا۔ "کدھر جا رہی ہو؟"

اس نے ہاتھ چھڑانے کی ایک ناکام سی کوشش کی۔ اس کے پتلے پتلے لب کانپے جس طرح بید کی پتیاں ہوا میں کانپتی ہیں۔ مگر وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا چنار کے درختوں کی طرف لے چلا۔ وہ نا، نا کرتی جا رہی تھی اور مجھ سے لپٹتی جا رہی تھی۔

ایک بڑے چنار کے نیچے ہم جا کر بیٹھ گئے۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے (اس کے ہاتھ کو چوم کر کہا۔ "مجھے تم سے محبت ہے۔ اے بن والی دوشیزہ۔ مجھے تم سے بے اندازہ محبت ہے۔") بیشک میں جھوٹ بول رہا تھا۔ لیکن میں تو اسے اپنا حق سمجھتا تھا۔ یوں بھی تو محبت میں آفت خدا نے عورتوں ہی کو ودیعت کی ہے۔

اس نے سحر طراز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور باریک سی آواز میں کچھ کہا۔ مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ کشمیری زبان میں بول رہی تھی بہرحال

اس کا لب و لہجہ نہایت دلکش تھا۔

"ادھر دیکھو۔" میں نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھ کے کہا۔ "مجھے ۔۔۔ تم ۔۔۔ سے محبت ہے۔"

میں رُک رُک کر اسے عاشقوں کی زبان میں سمجھا رہا تھا ۔۔۔۔۔ "میرا ۔۔۔۔۔ نام ۔۔۔۔۔" میں نے ہاتھ کے اشاروں سے بتلاتے ہوئے کہا۔ "میرا نام فیروز ہے اور ۔۔۔۔ تمہارا ۔۔۔۔۔ نام ۔۔۔۔۔ کیا ہے؟"

معلوم نہیں اُس نے کیا سمجھا۔ وہ جلد جلد اپنی زبان میں کچھ کہنے لگی۔ وہ نہایت روانی سے اور غالباً نہایت فصاحت سے بول رہی تھی۔

الفت۔ جیجی۔ شوہر۔ یہی تین لفظ میری سمجھ میں آئے۔ بولتے بولتے اُس کی آواز بھرّا گئی۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کچھ توقف کے بعد میں نے اسکے آنسو پونچھ ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے جھٹ مُنہ پھیر لیا اور ۔۔۔ اور بھی زور سے رونے لگی۔

(وہ ایک معصوم بچے کی طرح رونے پہ گویا تُلی ہوئی تھی) یہ دیکھ کر میں نے بھی اسے بچوں کی طرح گدگدانا شروع کیا۔ اور اتنا گدگدایا کہ وہ روتی ہوئی مسکرا پڑی۔ اور پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

اب کہو۔ میں نے اسے ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔ پھر روؤ گی۔ جیسے وہ میری بات سمجھ گئی۔ اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

کچھ دیر ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ میں نے آسمان کی طرف

دیکھا۔ دُور، کہیں کہیں تارے جھلملا رہے تھے اور چنار کی چھپی ہوئی ٹہنیوں کے درمیان بچا ہوا ٹکڑا بھی کسی دوشیزہ کے ٹوٹے ہوئے کنگن کی طرح اٹک کر رہ گیا تھا۔ ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے آرہے تھے۔ اور ان کے دوش پر شکارے چلانے والے ماجھیوں کی پُر کیف صدائیں لرز رہی تھیں۔

میں نے کشمیری دوشیزہ کی طرف حریصانہ نگاہوں سے دیکھا۔ اپنی باہیں اس کی کمر میں ڈال دیں کہ اسے اپنی آغوش میں لے لوں۔ اس نے آہستہ مگر مصمم ارادے سے اپنے آپ کو میری گرفت سے چھڑا لیا۔ اور سرزنش کے انداز میں مجھ سے کچھ کہنے لگی۔

صرف دو لفظ میری سمجھ میں آئے۔ گناہ..... گناہ.......... میری جان!

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ اگر یہ گناہ ہے تو ہوا کرے۔ یہ گناہ محبت ہے۔

اس نے تڑپ کر ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ اور میری طرف شعلہ بار نگاہوں سے دیکھ کر کچھ کہنے لگی۔ غالباً ملامت کر رہی تھی۔ میں سر جھکائے سن رہا تھا۔

شاید اسے مجھ پر کچھ رحم آگیا۔ اس نے میری طرف عجیب نگاہوں سے دیکھا۔ اپنے بازو میری گردن میں ڈال دیئے اور میرے کان میں کچھ پیار پیارے الفاظ کہہ کر بھاگ گئی۔ چنار اور بلوط کے درختوں میں سے گزرتی ہوئی یہ جا، وہ جا۔ ایک دم غائب ہوگئی۔

میں کچھ دیر ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ سے اٹھا۔ اپنی

چھڑی اُٹھائی اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔

"یار تم نرے گدھے ہو۔ گدھے اور احمق اور اُلو!

دوسرے دن دوپہر کو میں چھت پہ چڑھا اور چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن جانِ آرزو کہیں نظر نہ آئی۔ اوکھلی منہ کھولے پڑی تھی۔ اور ساتھ ہی موسل بھی پڑا ہوا دھوپ سینک رہا تھا۔ نہ دھان کی بوری کہیں نظر آتی تھی نہ دھان کوٹنے والی۔ میں حیران تھا اور ولکاکس کا ایک ناول گھٹنوں پہ رکھے یوں ہی سوچ رہا تھا آج دھوپ کتنی فرحت بخش ہے۔ وہ آج کدھر چلی گئی ہے؟ کہیں بیمار نہ ہو گئی ہو۔ دریا کا پانی آج کس طرح نیلم کی طرح چمک رہا ہے وہ نیلا پیرہن اسے کتنا بھلا معلوم دیتا تھا۔ اور وہ گلے میں سرخ منکے مگر ہے بہت شوخ و شنگ۔ میں اسے جتنی بھولی سمجھتا تھا۔ وہ اتنی ہی طرار نکلی۔

رحمن میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنے ابرو استفہامیہ انداز میں اُوپر اُٹھائے۔ وہ مسکرا کر کہنے لگا۔ آج فریزی کو خوب مار پڑی۔ فریزی؟ فریزی؟ کون فریزی؟

رحمن نے بند کی طرف اشارہ کیا۔ وہی دھان کوٹنے والی۔ فریزی .....

فریزی ..... میں نے آہستہ سے دل میں دہراتے ہوئے کہا۔ خوبصورت نام ہے۔ فریزی ..... فیروزہ ..... فریزی۔ ولکاکس سے بدرجہا اچھا ہے۔ اونہہ! ولکاکس بھی بھلا کوئی نام ہے!

اور رحمن آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ اس کے باپ نے۔ اس کے بھائی نے۔ اور

اس کے ہونے والے شوہر نے اسے خوب ہی پیٹا۔ کل شام کو پتہ نہیں وہ کدھر چلی گئی تھی۔ اور بہت دیر کے بعد واپس آئی تھی۔ اِن عورتوں کا کیا اعتبار ہے۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے اس کے منگیتر نے اس کے لئے نیلا ریشمی چغہ خریدا تھا کہ وہ اسے نکاح کے روز پہنے۔ کمبخت وہی نیلا چغہ پہن کر کہیں چلی گئی تھی۔ گویا کہیں اپنا بیاہ رچانے جا رہی تھی۔ اِن عورتوں کا کیا اعتبار ہے۔ مگر آج پٹی بھی خوب ہے۔ عمر بھر یاد رکھے گی۔

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" میں نے گرج کر کہا۔ "دور ہو جاؤ یہاں سے۔ میں نے تم سے کب کہا ہے کہ فریزی اور اس کے منگیتر کے قصے یوں مجھے آکر سناؤ؟" یہ کہکر میں نے کتاب کو زور سے کھولا۔ اور اسے نہایت توجہ سے پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

گو میں نے نگاہ اوپر نہ اٹھائی تھی۔ لیکن بخوبی جان گیا تھا کہ شیطان میری طرف دیکھ کر ہنس رہا ہے۔ میں نے اس کی طرف مزید توجہ کرنی مناسب نہ سمجھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے اس کے واپس چلے جانے کی چاپ سنائی دی۔ میں نے گردن اٹھا کر دیکھا تو سامنے فریزی کھڑی تھی۔ ایک ہاتھ میں دھانوں سے بھرا ہوا تھیلا پکڑے تھی۔ اور دوسرے ہاتھ سے بار بار آنسو پونچھتی جاتی تھی۔ ہاں وہ رو رہی تھی۔ اور مجھے دیکھ کر اور بھی زور زور سے رونے لگی۔ میں نے پریشان ہو کر نگاہیں پھیر لیں۔ یہ لڑکی تو مجھے مفت میں بدنام کر دیگی۔ میں بھلا اس معاملے میں کیا کر سکتا ہوں۔ کمبخت روئے جاتی ہے۔ میں نے دل میں سوچا کتنی اجڈ ہے اور گنوار۔ کس طرح میری

طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہے اور روئے جاتی ہے۔ مجھے نیچے ہی چلنا چاہیئے
میں اپنے دل میں اپنی غلطی پر پچھتا رہا تھا۔ اور اس بے وقوف لڑکی کو
کوس رہا تھا۔

میں نے کتاب اٹھائی۔ کرسی کو تہ کیا اور اسے بازوؤں میں لٹکائے ہوئے
فرنیزی کی طرف نگاہ کئے بغیر نیچے اُتر گیا۔ نچلی منزل میں زینے کے قریب بھابی جان
کھڑی تھیں۔ کہنے لگیں "نیچے اُتر آئے ہو۔ دھوپ تیز ہو گئی ہے؟" میں
نے جلدی سے کہا۔ "اور سر میں ہلکا سا درد بھی محسوس کرتا ہوں۔" تمام
دن بستر پر لیٹا رہا۔ اور پھر جتنے دن سرینگر میں رہا۔ کبھی چھت پر نہیں گیا۔ سات
آٹھ روز اسی طرح رہنے کے بعد میں نے بھائی صاحب سے صاف کہدیا کہ
میرا تو اب یہاں دل نہیں لگتا۔

"واپس شجاع آباد چلے جاؤ۔"

"بہت اچھا" میں نے کہا۔ اور دوسرے دن ہی سرینگر سے گھر کی طرف
روانہ ہو گیا۔

....

اتنا کہکر فیروز خاموش ہو گیا اور ہاؤس بوٹ کے ڈرائنگ روم کے
دریچے سے باہر دیکھنے لگا۔

بس؟ میں نے آہستہ سے پوچھا مجھے غیر محسوس طریقہ پر یقین ہو گیا
تھا۔ کہ داستان کا دلچسپ حصہ ابھی باقی ہے۔ اس لئے کچھ توقف کے بعد
میں نے پھر استفسار کیا۔ بس؟

فیروز نے آہستہ سے ایک سگار سُلگایا۔ ایک دو کش لگائے اور دُھوئیں کے مرغولے ہوا میں چھوڑتے ہُوئے رُک رُک کر کہنے لگا۔ نہیں.... تو.... اچھا.... بقیہ بھی سُن لو۔

. . . .

گھر پہنچ کر بھی میرا دِل نہ لگا۔ ہر وقت پریشانی سی رہتی تھی اور دِل میں ہر آن کُچھ عجیب سی بے چینی اور بے کلی پاتا تھا۔ کچھ عجیب سی حالت تھی کہ جس کا ہر بار تجزیہ کرنے پر بھی کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ کبھی سوچتا مَیں نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔ کبھی سوچتا۔ مَیں نے جو کچھ کیا۔ موقع و محل کے مُطابق وُہ ٹھیک تھا۔ اور اگر ایسا نہ کرتا تو شاید۔ اِس گنوارن کے لئے اپنی آبرُو مٹی میں ملا لیتا۔ اور پھر یکایک اِس گنوارن کا بھولا روتا ہُوا چہرہ سامنے آجاتا۔ دِل میں ایک کسک سی ہوتی اور مَیں بے اختیار اپنے آپ کو ملامت کرنے لگتا۔ پھر اپنے آپ کو تسلی دیتا۔ مَیں نے آخر کیا ہی کیا۔ جہاں تک میرا خیال ہے مَیں نے ہرگز کوئی گناہ نہیں کیا۔ کم از کم اِس معاملے میں تو میرا ضمیر صاف ہے۔ مگر پھر وُہی روتا ہُوا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا۔ اور اِن نیلی آنکھوں سے بہتے ہُوئے طُوفان کے آگے میری سب طِفل تسلیاں ریت کی دیوار کی طرح بہ جاتیں۔

اِسی طرح ڈیڑھ ہفتہ اور گزر گیا۔ خزاں آئی اور خزاں کے آتے ہی بھائی صاحب اور بھابی جان بھی سرینگر سے آگئے۔ مَیں اسٹیشن پر اِنہیں لینے گیا تھا۔ بھابی جان اب بالکل اچھی ہو گئی تھیں۔ اور اِن کے بشاش

اور پُر رونق چہرے کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے مجھے بہت مسرّت ہُوئی۔ دُوسرے ہی لمحے میں نہ جانے کیوں میں اُداس ہو گیا۔ آدمی کی نفسیاتی زندگی میں پروازِ خیال بھی عجیب چیز ہے۔ بھابی جان کو دیکھتے ہی فریزی یاد آ گئی۔ کتنی عجیب بات تھی۔ مگر میں سچ کہتا ہُوں کہ پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے میں صاف اور واضح طور پر فریزی کے طول چہرے اور اندوہگیں آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ یا شاید یہ سب واہمہ ہی تھا۔ بھائی صاحب نے میرا چہرہ یکایک اُترا ہُوا دیکھ کر کہا۔ کس سوچ میں پڑے ہو؟

کچھ نہیں۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ اور ہم موٹر میں بیٹھ کر گھر آ گئے۔

شام کا کھانا کھا کر دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ سفر کی باتیں اور سرینگر کی باتیں۔ سن مرگ اور پہلگام کے مناظر، کسٹم والوں کی بے ضابطگیاں۔ زعفران کے کھیت اور ڈرائیور کی بدمستیاں۔ اِسی طرح باتیں کرتے کرتے بھائی صاحب آنکھیں جھپکنے لگے۔ سفر سے تھکے ہُوئے تھے۔ میں بھی اُٹھ کر خواب گاہ میں چلا آیا۔

خواب گاہ کے اندر رحمن بستر جھاڑ رہا تھا۔ مجھے اندر آتے دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے رُکا۔ پھر بستر جھاڑتے ہُوئے کہنے لگا۔ "لیکن یہ حقیقت ہے کہ اِسے آپ سے محبّت ہو گئی تھی۔ اِس کی نگاہیں ہمیشہ ہاؤس بوٹ کی چھت پر کسی کو ڈھونڈا کرتیں۔ اور پھر وُہ اُسی طرح تکتے تکتے بے اختیار ہو کر رونے لگتی۔ میرے دِل پر ایک تیر سا لگا۔ آہ! وُہ مجھ سے محبّت کرتی تھی.... ایک دوشیزہ کی پہلی والہانہ محبّت۔ اِس کے ماں باپ نے اِسے بہت سمجھایا بجھایا اور آخر تنگ آ کر اِس کی شادی کر دی۔"

"ارے۔" میں نے چونک کر کہا۔

شادی سے ایک روز پہلے وہ میرے پاس آئی۔ رحمٰن نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ وہی نیلا ریشمی جُبہ پہنے ہوئے تھی۔ وہ نہایت مطمئن معلوم ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رو رو کر اِس کی آنکھوں کے چشمے سوکھ گئے ہیں۔ اور چلا چلا کر اِس کے گلے میں آواز کی قوت باقی نہیں رہی۔ "وہ کدھر گئے ہیں؟" اس نے کھوکھلی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"وہ گھر واپس چلے گئے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

اِس پر وہ چیخی نہ چلائی۔ گردن جھکا کے چپ چاپ دیر تک کھڑی رہی۔ پھر آہستہ سے بولی۔

"وہ کب آئیں گے؟"

مجھے اس پر رحم آ رہا تھا۔ ریشمی جُبہ پہنے ہوئے بھی وہ کس قدر غریب معلوم ہو رہی تھی۔ غریب اور بیکس۔ کتنی بے چارگی اِس کے لہجے میں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنی اِس چھوٹی سی عمر میں مصائب و آلام کے سوا اور کچھ دیکھا ہی نہیں۔ وہ گردن جھکائے کھڑی تھی۔ اور میرے جواب کی منتظر تھی (اس کے پھول سے رخسار جو کبھی سیب کی طرح سُرخ تھے آج برف کے گالوں کی طرح سفید ہو گئے تھے۔ وہ موم کی گڑیا معلوم ہوتی تھی۔ کاش میں اسے تسلی دے سکتا۔) کاش یہ میرے بس میں ہوتا کہ میں اس کی آس بندھا سکتا۔ اور اس کے زرد زرد چہرے پہ مسرت کی لہریں دوڑا سکتا۔)

یہ کہہ کر رحمن کچھ دیر چپ رہا۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔
دُوسرے روز اِس کی شادی ہو گئی۔ شادی کے تیسرے روز وُہ اپنی
بیوی کو کھڑکی میں مُردہ پائی گئی۔ اِس نے زہر کھا لیا تھا۔

فیروز خاموش ہو گیا۔ ہمارا شکارا ڈل میں داخل ہو چکا تھا۔ ہانجیوں
کے چپوؤں کی رفتار سُست پڑ گئی تھی۔ وُہ نہایت نرم اور پُر سوز لے
میں چپوؤں کی آواز کی تال پہ گا رہے تھے۔

"میرے پیارے آ تیرے باغ میں بہار آئی ہوئی ہے۔
میرے پریتم آ۔ آ کہ تیرے درخت پھلوں سے لدے پڑے ہیں۔
میرے پیارے آ کہ پھولوں کی بہار کا زمانہ میں نے کاہشِ انتظار میں
گزار دیا۔
میرے پریتم جلد آ۔ کہیں اِس بہار کو خزاں کا دیو نہ چٹ کر جائے۔"

"اور بس میری کہانی بھی یہاں ختم ہوتی ہے۔" فیروز نے آہستہ سے کہا۔ اِس
کے لبوں پہ ایک یاس انگیز مُسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وُہ کشتی کے پہلو پر جھک
گیا۔ اور ہاتھ سے اِشارہ کرتے ہُوئے بولا۔ "وہ وُہ دیکھتے ہو نا۔ وُہ جو
ڈل کے اِس طرف چنار کے درخت ہیں۔ وہاں اِس کنج میں سرسبز گھاس کے
نیچے میری فیرینزی محوِ خواب ہے۔ غرُوبِ آفتاب کے بعد وہاں چلو گے۔" اِدھر ملا بھائی۔
دُور بہت دُور ایک ہانجی اپنی کشتی کو کنارے پہ لگا رہا تھا۔ گانے کی آواز
نے شاید اِسے بھی متاثر کر دیا تھا۔ فضا کی خاموشیوں کو چیرتی ہُوئی پانی
کی لہروں سے ٹکراتی ہُوئی اِس کی سُریلی آواز صاف سُنائی دے رہی تھی۔

آہ۔ میرے پریتم! تیرے باغ میں بہار آئی اور چلی بھی گئی۔

آہ۔ میرے پیارے! تیرے درختوں پر پھول کھلے اور مرجھا بھی گئے۔

آہ میرے پریتم! درختوں کے پتے انتظار میں زرد ہو گئے اور ان پر برف ایک سفید دیو کی طرح چھا رہی ہے۔

آہ۔ میرے پیارے! تو نے اپنے خزانے کو یوں لُٹا ہوا چھوڑ کر پردیس کیوں جا بسا؟

میں نے اس کا ہاتھ زور سے دبا دیا۔ میری آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور ہم دونوں پردہ اُٹھا کر باہر دیکھنے لگے۔

ڈل کی نیلی نیلی لہروں پر آفتاب کی آخری کرنیں لرزاں تھیں۔ ہوا میں پھولوں کی بُو بسی ہوئی تھی۔ ہمارے اِردگرد کنول کے پھول تیر رہے تھے اور اِن کی نازک پتیوں پر پانی کے قطرے ٹکے ہوئے تھے۔ کسی کی پلکوں پر آنسوؤں کی طرح اور شفق کی ارغوانی روشنی میں چمک رہے تھے کسی کے گلے میں سُرخ منکوں کی طرح۔

ویکسی نیٹر

Vaccinator.

جب میں ایف۔اے۔ میں فیل ہو کر اِس گاؤں میں ویکسی نیٹر بن کر گیا تو وہ چیز جس کی کشش نے مجھے سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کیا ریشماں تھی۔ ریشماں کے حسن و جمال کا چرچا تو میں اِس سے پہلے بھی بہتوں سے سن چکا ہوں۔ اور خاص کر راستے میں ایک پولیس سارجنٹ نے جب اُسے معلوم ہوا کہ میں پنڈور کے گاؤں میں ویکسی نیٹر بن کر جا رہا ہوں۔ مجھے بتایا کہ "پنڈور کی دلکش وادی میں یوں تو بہت سی چیزیں اور جگہیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ لکشمن جی کا کنڈ جس کی گہرائی کا پتہ آج تک کوئی انگریز بھی نہیں لگا سکا۔ جاگیردار صاحب کا پرانا محل جس کے چوکور برج دھوپ میں سونے کی طرح چمکتے ہیں، اور جو آج کل ویران پڑا ہے اور صرف اُسی وقت استعمال کیا جاتا ہے۔ جب جاگیردار صاحب

در

یا اِن کے مہمان یا لرڈ کے بابے کبھی پنڈور کی وادی میں شکار کھیلنے کی غرض سے تشریف لاتے ہیں۔ کھٹے اناروں کا جنگل، جو پنڈور کی مغربی پہاڑیوں پر پھیلا ہُوا ہے اور جہاں جنگلی ٹمبنگ۔ سیب۔ آلوچے۔ بہی اور املوک کے درخت بھی پائے جاتے ہیں۔ جہاں جنگلی گلاب کی بیلیں کسی محبوب کی باھوں کی طرح پھل دار درختوں سے ہر وقت لپٹی رہتی ہیں اور جن کی آغوش میں بنفشے کے پھول ہر لحظ مُسکراتے اور شرماتے ہیں۔ ہاں پنڈور کی وادی میں بہت سی چیزیں دیکھنے کے لائق ہیں۔ لیکن وہاں اگر تُم نے ریشماں کو نہ دیکھا تو سمجھ لینا کہ تُم نے پنڈور میں کچھ نہیں دیکھا۔"

"سچ مچ!" میں نے آہستہ سے پُوچھا۔

"خُدا کی قسم" ۔ پولیس سارجنٹ نے ایک لمبی آہ بھر کر کہا اور گھوڑے پر سوار ہو کر چلا گیا۔

اگرچہ مجھے یقین تو اب بھی نہ ہُوا۔ لیکن ریشماں کو دیکھنے کا شوق دِل میں گھر کر گیا۔ آخر وُہ بھی ایسی کیا حسین پری ہو گی؟ اِن پولیس والوں کی باتوں پر اعتماد کم ہی کرنا چاہیئے۔ اور پھر عورتوں کے متعلق تو اِن کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر عورت حسین ہوتی ہے۔ چاہے وُہ مٹی ہی کی کیوں نہ ہو۔

اب تو میری حالت اُس بُوڑھے مُرغ کی سی ہے جو شباب گزر جانے پر بھی اپنے آپ کو جوان سمجھتا ہے۔ لیکن اُن دِنوں جب میں نیا نیا ویکسی نیٹر بن کر یہاں آیا تھا۔ تو میری شکل و شباہت بہت سے لوگوں کے لئے قابلِ رشک تھی۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ اِن دِنوں گاؤں بھر میں بس میں ہی اپنے ڈھنگ کا ایک سجیلا جوان

تھا۔ اور پھر انٹرنس پاس اور سفید لٹھے کی شلواریں پہننے والا۔ گیارہ روپے تنخواہ تھی۔ کلاہ پر طرہ دار لنگی، پاؤں میں کام دار جوتی اور چہرے پر مونچھیں سائیکل کے ہینڈل کی طرح مڑی ہوئی۔ ہاں وہ زمانہ تھا میرے بانکپن کا، اب تو جوانی کی بہاریں خزاں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔

آہ۔ دوست وہ بھی کیا دن تھے، کاش تم نے مجھے جوانی میں دیکھا ہوتا۔ دیوان غالب میں ایک شعر مجھے بہت پسند ہے۔ وہ ہے ... وہ ہے ... آہ، اس وقت کم بخت یاد نہیں آرہا۔ دماغ چکرا ..... زبان پہ آرہا ہے، لیکن ـــــ اچھا!

ہاں، تو میں ریشماں کے متعلق کہہ رہا تھا۔ لیکن میں ریشماں کے متعلق کیا کہوں۔ ریشماں کی آنکھیں، ان نیلی پتلیوں کی اتھاہ گہرائیاں، وہ آنکھیں ان دو پاک صاف جھیلوں کی مانند تھیں جو کسی اونچے پہاڑ کی چوٹی پہ واقع ہوں۔ جہاں کسی انسان کے قدم بھی نہ پہنچے ہوں۔ ریشماں کے نازک لب، شرمسار، محجوب سے لب، جیسے وہ اپنی خوبصورتی پہ خود ہی پشیمان ہوں۔ اس کے نازک ہاتھ، مرمریں انگلیوں کی پوریں۔ جنگلی گلاب کی کلیوں کی طرح حسین۔ اس کی چال جیسے دوشیزہ بہار اپنی تمام تر لطافتوں اور رعنائیوں کے ساتھ ہوا کے دوش پہ اٹھلاتی ہوئی آگئی ہو۔ اس کی آواز صنوبر کے جنگلوں میں گھومتے ہوئے گڈریئے کی بنسری کی طرح میٹھی اور ابلتے ہوئے ٹھنڈے چشموں کے ترنم کی طرح لوچدار۔ اس کا قد، فارسی کا ایک شعر، ایک نہایت ہی موزوں شعر ہے۔ لیکن .... کمبخت یاد نہیں آرہا۔ بالکل زبان پہ پھر

دہا ہے۔ آہ! کیا خوب شعر تھا۔ نظیری کا شعر نہیں عرفی کا۔ آہ، اب حافظہ کس قدر کمزور ہو گیا ہے۔ کچھ یاد نہیں رہتا۔ مجھے اب تو اپنا کلام بھی یاد نہیں، حیرت ہے اِن دِنوں میرا حافظہ کس قدر تیز تھا۔

تو یہ تھی ریشماں، پنڈورکی وادی کی حسینہ بے شک ایک نایاب چیز تھی۔ اور لوگ دُور دُور سے اُسے دیکھنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ اِس کے باپ کو ہر روز ریشماں کے ناطے کے لئے پیغام آیا کرتے۔ کوئی پانچسو روپے، کوئی ایک ہزار، کوئی ڈیڑھ ہزار اور کوئی من چلا تین ہزار روپے تک دینے کو تیار تھا، لیکن اِس کا باپ شاید صرف نفی میں ہی جواب دینا جانتا تھا کم از کم میں نے تو اُسے ہامی بھرتے نہیں دیکھا نہ سُنا۔ خدا جانے اِسکے دِل میں کیا تھا۔ شاید وُہ اپنی لڑکی کو کسی بادشاہ کے ہاں دینا چاہتا تھا۔ اور یوں بھی تو ریشماں کسی بادشاہ کے گھر کے ہی لائق تھی۔

لیکن جیسا کہ میں نے کہا جوانی بڑی بلا ہے۔ اور جوانی کی محبت اِس سے بھی زیادہ خطرناک۔ میں نے ریشماں کو دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ دُنیا میں ریشماں صرف میرے لیئے ہے اور میں اِس کے لئے۔ اور یہ ٹھان لی کہ چاہے اِس کے باپ کو قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑے، اِسے اغوا ہی کیوں نہ کرنا پڑے، لیکن اگر شادی ہو گی تو صرف ریشماں سے، نہیں تو جان پر کھیل جاؤں گا۔ اِس کے سارے خاندان کو تہ تیغ کر دُوں گا۔ سارے گاؤں کو آگ لگا دُوں گا۔ اِس کے سامنے پہاڑی پر سے نیچے نالے میں کُود کر مر جاؤں گا۔ لیکن یہ کبھی گوارا نہ ہو گا۔ کہ میرے جیتے

جی میری ریشماں کو کوئی اور شخص، چاہے وُہ جاگیردار کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو، بیاہ کر لے جائے۔ جوانی میں آدمی کیسی کیسی عجیب باتیں کرتا ہے۔ بیوقوفوں کی سی باتیں فضول۔ خطرناک۔ عاقبت نااندیشانہ۔

تو صاحب! مَیں نے ریشماں کی محبت میں سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ لوگوں کو ٹیکہ وِیکہ لگانا کیسا؟ ہر وقت ریشماں کے پیچھے پیچھے پھرنے لگا۔ پاگل کُتّے کی طرح، وُہ چشمے پر پانی بھرنے جاتی تو مجھے پہلے ہی موجود پاتی۔ چرواہوں کے ساتھ جنگل جاتی تو میں بھی اپنی توڑے دار بندوق لیے ہوئے جنگل میں آموجود ہوتا۔ مَیں اِن دِنوں گانا بھی اچھا جانتا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ مَیں ماہیا بہت مزے سے گایا کرتا تھا۔ اور اکثر لوگ میرے ماہیا گانے پر بہت خوش ہوتے تھے۔ کہتے تھے کہ کوئی مراثی بھی اِتنا اچھا ماہیا نہیں گا سکتا۔ لیکن اب وُہ دِن کہاں، اب تو دِن میں دس بار مجھے کھانسی کی شکایت ہوتی ہے۔ تم شہر میں رہتے ہو۔ کبھی کوئی اچھی دوا ہی بھیج دیا کرو۔ ورنہ تمہارے شہر میں رہنے کا ہمیں کیا فائدہ۔ کیوں؟.....

خیر..... ایک دن کی بات ہے۔ مَیں کسی قریب کے موضع سے چیچک کے ٹیکے لگا کر واپس آرہا تھا۔ شام ہو چکی تھی اور مغرب سے ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ مَیں بہت مغموم تھا کیونکہ دِن بھر میں گاؤں سے باہر رہنے کی وجہ سے ریشماں کے دیدار سے محروم رہا تھا۔ چنانچہ بہت ہی حزیں لہجہ میں آہستہ آہستہ ع

"فراق جاناں میں ہم نے ساقی لہو پیا ہے شراب کر کے"

گاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ میں اِس وقت بہت اُداس تھا۔ میری آنکھیں شاید اُس وقت آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں۔ اور مجھے اپنے آپ پر بہت افسوس آ رہا تھا۔ گاؤں کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے راستے میں ایک خوبانی کا درخت آتا ہے۔ چنانچہ جب میں اِس خوبانی کے درخت کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ تنے کا سہارا لئے اپنی سُنہری کاکلوں کو اپنے نازک شانوں پر پریشان کئے ریشماں کھڑی میری راہ تک رہی ہے۔ میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

چند لمحے چند صدیوں کی طرح گذرے۔ پھر ریشماں بولی۔ اپنی نرم میٹھی آواز میں ـــ "جی آپ مجھے کیوں تنگ کرتے ہیں؟" میں نے کہا۔ اِس لئے کہ میں تمہیں چاہتا ہوں۔ اور تمہیں دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

ریشماں بولی ـــ "جی، مجھے سب سہیلیاں طعنے دیتی ہیں۔ اور پھر اس طرح آپ کا میرے پیچھے پیچھے پھرنا ٹھیک نہیں۔ میں آپ کو گالیاں دوں گی تو پھر آپ ...."

میں نے کہا۔ "تو میں نے کب منع کیا ہے۔ آپ شوق سے گالیاں دیں۔ میں اُنہیں سُنتا جاؤں گا۔ اور پھر اُنہیں اکٹھا کر لوں گا۔ پھولوں کی طرح، پھر اُن کے ہار بنا کر اپنے گلے میں پہن لوں گا۔"

ریشماں بولی۔ "ہم ٹھہریں ان پڑھ۔ بھلا ہمیں آپ کی طرح باتیں بنانا کہاں سے آئے۔ لیکن میں آپ سے پھر کہتی ہوں، خدا کے لئے آپ میرا پیچھا کرنا چھوڑ دیں۔ ابا آپ کی جان کے لاگو ہو رہے ہیں۔ کہتے تھے

اگر وُہ لڑکا باز نہ آیا تو اُسے قتل کر ڈالوں گا۔"

میں نے سر جھکا کر کہا۔" یہ سر حاضر ہے۔ ابھی گردن اُڑا دیجئے۔ اگر اُف کر جاؤں تو ......"

ریشماں نے ایک عجب ادا سے سر ہلا کر کہا۔" ہائے، میں یہ کب کہتی ہوں کہ آپ مر جائیں، لیکن آخر...... آپ چاہتے کیا ہیں؟"

" میں کچھ نہیں چاہتا۔ میں نے اپنا ہاتھ اپنے کلیجے پر رکھ کر کہا۔" ہاں، صرف یہ چاہتا ہوں کہ جب تم یہاں چلی جاؤ تو تمہارے پیارے پیارے قدموں کی خاک اپنے ماتھے سے لگاؤں۔ اور تمہارا نام لیتا ہُوا اسی دم اِس دُنیا سے رُخصت ہو جاؤں۔"

ریشماں مُسکرائی۔ ایک لڑکی کی طرح نہیں۔ بلکہ ایک عورت کی طرح مُسکرائی۔ اُس نے پلکیں اُٹھا کر ایک لمحہ کے لئے مجھے دیکھا۔ پھر وُہ پلکیں گلاب کے پھولوں کی طرح خوشنما اور نازک گالوں پر جھک گئیں۔ دُوسرے لمحہ ہنستے ہُوئے وُہ وہاں سے بھاگ گئی۔ بھاگتی جاتی تھی اور مُڑ مُڑ کر میری طرف دیکھتی جاتی تھی۔

چند لمحے تو میں چُپ چاپ پتھر کے بُت کی طرح ساکن کھڑا رہا۔ پھر میں نے ریشماں کے پیچھے تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا۔ وُہ ایک ہرنی کی طرح تیز بھاگ رہی تھی۔ اِس کے مُنہ سے ہنسی کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں، آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر ہم دونوں کے درمیان فاصلہ کم ہو رہا تھا۔۔۔ اب میں اِس کے بالکل قریب آ گیا تھا۔ لیکن میں اِسے چھو نہیں سکتا تھا۔

وُہ اب زیادہ تیزی سے بھاگنے لگی۔
لیکن میں اَب اَور بھی قریب آ گیا تھا۔ اَور ہمارے درمیان بالکل تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا تھا۔
"دیکھو، ہمیں۔۔۔۔۔ ہمارا پیچھا مت کرو۔۔۔۔۔ میں کہتی ہُوں یہ اچھا نہیں۔۔۔۔۔۔"
ایک چھلانگ لگا کر میں نے اُسے جا دبوچا اَور آغوش میں اُٹھا لیا۔ "اب کدھر جاؤ گی؟"
"مجھے چھوڑ دو۔۔۔۔۔ مجھے چھوڑ دو۔۔۔۔۔ میں گھر جاؤں گی۔" اِس نے کمزور سی آواز میں کہا۔
میں ایک چنار کے درخت کے قریب جا کر رُک گیا۔ اَور اِسے سبز روش پہ آہستہ سے گرا دیا۔ اَور پھر اِس کے قریب ہی سستانے کے لئے بیٹھ گیا۔
"دیکھا تُم نے؟" مجھ سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتیں۔ میں نے ہنس کر کہا۔
وُہ خاموش بیٹھی رہی اَور اپنے پریشان بال دُرست کرتی رہی۔
ہم گاؤں سے بہت دُور نکل آئے تھے، شفق گُم ہو چکی تھی لیکن پھر بھی ندی کا پانی ایک چاندی کے تار کی طرح چمک رہا تھا۔ ہاں، پہاڑوں پہ اب جنگل نہ دکھائی دیتے تھے، اندھیرے کی سیاہی میں غائب ہو چکے تھے۔ کہیں کہیں تارے بھی نکل آئے تھے۔

میں نے ریشماں سے پوچھا۔ "تم مجھ سے کب نکاح کرو گی؟"

"کبھی نہیں!"

"وہ کیوں؟"

"تم تیلی ہو۔ ہم مغل ہیں۔" ریشماں نے شوخی سے کہا۔

اس سے کیا ہونا ہے؟ میں نے ریشماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کہا۔ "کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں؟"

"ہرگز نہیں!"

"تو پھر تم میرے پاس کیوں بیٹھی ہو؟"

جواب میں ریشماں نے میری طرف پیار بھری نگاہوں سے دیکھا۔ پھر یکایک کسی خیال کے زیر اثر وہ کانپ اُٹھی۔ اور آہستہ سے کہنے لگی۔ "میں آج خوب پٹوں گی۔ ابا مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ ویسے یہ کہہ تو آئی تھی کہ میں خالہ کے ہاں جا رہی ہوں۔ لیکن اب دیر بھی تو بہت....."

میں نے قطع کلام کر کے کہا۔ "تجھ ایسی شریر لڑکی اسی لائق ہے کہ اسے خوب پیٹا جائے۔"

ریشماں بولی۔ "میں جانتی ہوں تم مجھے کبھی نہیں پیٹو گے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ کیونکہ میں ایک تیلی ہوں اور تم مغل زادی ہو۔"

ریشماں نے اپنا نازک ہاتھ میرے کندھے سے لگایا۔ پھر بے اختیار اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔

"تم کتنے ناشکرے ہو۔" اُس نے ایک آہ بھر کر کہا۔
اور مجھے ایسا معلوم ہُوا۔ کہ یکایک آسمان کے ستارے کھلکھلا کر ہنس پڑے ہیں اور چاند کی روشنی میں سفید سفید بادلوں کے کانپتے ہوئے نازک سائے کسی نامعلوم خوشی کے زیرِ اثر ناچنے لگے ہیں۔ اور مغربی ہَوا کے جھونکے چنار کے پتّوں میں چھپ چھپ کر غیر فانی زندگی کے گیت گا رہے ہیں۔ مَیں نے ریشماں کی لمبی لمبی زلفوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہُوئے محسُوس کیا کہ یہ خوشی میرے لئے ناقابلِ برداشت ہو گی۔ اور جب مَیں نے فرطِ شوق سے بے اختیار ہو کر اپنے لب اُس کے لبوں پر رکھ دیئے تو مجھے معلوم ہُوا کہ اِن ہونٹوں میں پہاڑی شہد کی سی مٹھاس تھی اور دہکتے ہُوئے انگاروں کی سی گرمی اور جلن، دونوں ہی احساس تھے، ایک تکلیف دہ خوشی اور ایک جان بخش اذیّت۔

اِس کے بعد آٹھ دس دِنوں کے کوائف میں تمہیں اچھی طرح نہیں بتا سکتا۔ مجھے یاد نہیں آتا، زندگی ایک دل خوش کُن خواب کی طرح گذر رہی تھی جس میں مَیں اور ریشماں ہی تھے۔ کچھ عجب سی حالت تھی۔ شراب کا سا نشہ۔ دلفریب نغموں کا سا سرور۔ سارا گاؤں جنّت نظر آتا تھا۔ اور دُور سے جاگیردار صاحب کے پُرانے محل کے بُرج سونے کے کلسوں کی طرح چمکتے تھے عجیب اور پُراسرار۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تمام دُنیا، قدرت کی رعنائیاں۔ پرندوں کے چہچہے۔ بے فکر گڈریوں کے قہقہے۔

ہمارے ہی لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ میرے اور ریشماں کے لئے۔ تاکہ شام کے جھٹپٹے میں ہم دونوں چھپ کر اور باہوں میں باہیں ڈال کر گاؤں کے باہر کسی ننھے سے مرغزار میں جا بیٹھیں۔ اور ان نظاروں سے لطف اندوز ہوں۔

لیکن یہ سب کچھ آٹھ دس دن کے لئے تھا۔ اس کے بعد ایک ظالم وحشی ہاتھ نے ایک پُرزور جھٹکے کے ساتھ میرے دلفریب خواب کو منتشر کر دیا۔ عین اُس دن جب ہم دونوں نے گاؤں سے بھاگ جانے کی صلاح کی تھی۔ ریشماں کے ظالم باپ نے اُسے جاگیردار صاحب کے بڑے لڑکے کے حوالے کر دیا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ بہت دیر سے در پردہ مشورے ہو رہے تھے۔ جاگیر صاحب کا بڑا لڑکا بہت اوباش ہے جس طرح بڑے آدمیوں کا خاصہ ہوتا ہے وہ ریشماں پر لٹو تھا۔ کہیں شکار کھیلنے آتے جاتے دیکھ لیا ہوگا۔ بس، ریشماں کے باپ پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔ اِدھر میری بے خبری کا یہ عالم کہ مجھے اُس وقت پتہ چلا کہ جب ریشماں شہر میں جاگیردار صاحب کے محل میں پہنچائی جا چکی تھی۔ ....

یہ چوٹ اتنی کاری اور ناگہانی تھی کہ میں اپنے حواس برقرار نہ رکھ سکا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اِس واقعہ کے بعد میں دو سال تک پاگل سا رہا۔ سوکھ کر بالکل کانٹا سا ہو گیا تھا۔ دربدر گھومتا تھا۔ اور لوگوں سے کہتا تھا "مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔ وہ مجھے کاٹنے کو آ رہی ہے۔ بس یہی وکلمات تھے جو ہر وقت میری زبان پر جاری رہتے۔ سنا ہے ایک دن جب میں جاگیردار صاحب

کے شہر میں گھوم رہا تھا اُنہوں نے مجھے کہیں دیکھ لیا۔ اور جب کپتان صاحب سے اُنہوں نے میری رام کہانی سُنی تو مجھ پر بہت ترس آیا اور علاج کے لئے شکار پور کے پاگلخانے میں بھیجدیا۔ اور جب میں دو سال کے بعد تندرست ہو گیا تو پھر مجھے اپنے پُرانے عہدے پر اسی وادی میں تعینات کر دیا۔ لیکن اِس گاؤں میں نہیں بلکہ دُور کے ایک گاؤں میں جو یہاں سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔

اِتنا کہکر وہ یکسی نیٹر چپ ہو گیا۔ اور حقہ گڑ گڑانے لگا۔ رشید نے آہستہ سے پُوچھا۔

"اور ریشماں ؟ ..... تم نے اُسے پھر کبھی دیکھا ؟"

"ریشماں جاگیردار صاحب کے بڑے لڑکے کے حرم میں ہے۔ اگرچہ وہاں عورتیں تو بہت ہیں۔ لیکن ریشماں کو اپنے مالک کی چہیتی ہونے کا فخر ضرور حاصل ہے۔ اِس کے دو لڑکے بھی ہیں ..... میں نے اسے آٹھ نو سال ہوئے اِس کے باپ کے گھر اسی گاؤں میں دیکھا تھا۔ جب وہ اپنے بھائی کی شادی پہ یہاں آئی تھی۔ اِس کا باپ، اب کیا یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے، کہ اِس گاؤں کا نمبردار ہے۔ اور علاقے کا ذیلدار۔ اِس کا مکان پتھروں سے بنا ہے۔ تم نے راستے میں دیکھا تو ہوگا وہ جس پہ ٹین کی چھت ہے اور جسکے عقب میں ایک بڑا سا باغیچہ ہے ..... میں نے اسے اِس باغیچہ میں دیکھا تھا۔ وہ خوبصورت ریشمیں لباس پہنے ٹہل رہی تھی۔ اِس کے ساتھ اِس کے دونوں چھوٹے چھوٹے لڑکے تھے۔ وہ اب بھی بے حد خوبصورت تھی۔ اِس کی چال شاہزادیوں جیسی تھی۔ میں دیر تک باڑ کی اوٹ میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ ریشماں جو کبھی میری منکوحہ ہوتی۔ ریشمی کپڑوں کی بجائے وہ

سوسی کی بھاری شلوار اور چھینٹ کی قمیض پہن کر میرے اور اپنے بچوں کو لیکر یوں ٹہلا کرتی۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے۔ اور نہیں پوچھنے کی کوشش کئے بغیر ہی میں باڑ کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ اور اُسے گالیاں دینے لگا۔ میں نے اُسے سخت فحش کلمات کہے۔ اس کے ماں باپ کو گالیاں دیں۔ اس سارے خاندان کو جی بھر بھر کر اور چیخ چیخ کر کوسا اور اس وقت تک وہاں سے نہ ٹلا جب تک لوگ مجھے وہاں سے کھینچکر اور گھسیٹ کر پرے نہ لے گئے۔"

"اور ریشماں نے تمہیں کچھ نہ کہا۔" رشید نے پوچھا۔

"نہیں، مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے گردن جھکا لی اور چپ چاپ گالیاں سنتی رہی۔ اس کی آنکھوں کی نیلی جھیلوں سے آنسوؤں کے چشمے بہہ نکلے اور اُس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دونوں لڑکوں کو اپنے ساتھ چمٹا لیا...... بعد میں جب وہ اپنے گاؤں سے چلی گئی تو اس کی ایک پرانی سہیلی نے مجھے بتایا کہ میرے اس سوال پر کہ تم نے وہاں باغیچہ میں کھڑی رہ کر اس کی گالیاں کیوں سنیں؟ ریشماں نے جواب دیا اُس وقت وہ اگر مجھے پیٹ ڈالتا یا جان سے مار ڈالتا، تو بھی میں وہاں سے نہ ہلتی...... پھر اس نے کہا۔ اے میری جان سہیلی! وہ گالیاں نہ تھیں پھول تھے، میرے محبوب کے، جنہیں میں نے چن چن کر آنسوؤں کے تار میں پرو لیا۔ اور اپنے دل کے مزار پر چڑھا دیا۔ تاکہ محبت کی قبر سونی نہ رہے۔

لیکن وہ بیکسی ہیٹر نے غمناک آواز میں داستان ختم کرتے ہوئے کہا۔ مجھے

اب کسی پر غصّہ نہیں۔ کسی سے محبت نہیں۔ میں اب کسی کا لحاظ نہیں رکھتا۔ پہلے چیچک کے ٹیکے مفت لگاتا تھا۔ اب دو آنے لیے بغیر کسی کے بازو کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ مجھے کسی کی پروا نہیں۔ میں اب اپنا روپیہ ڈیوڑھی فیس پر قرض دیتا ہوں۔ اِس گاؤں میں سوائے ریشماں کے باپ کے سب میرے قرضدار ہیں۔ وُہ مجھے کنجوس اور ظالم کہتے ہیں، لیکن انہوں نے کب میرا بھلا چاہا۔ اُن کا بس چلے تو مجھے آج قتل کر دیں، لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں۔ کسی سے محبت نہیں کسی پر غصّہ نہیں۔ میں جاگیردار صاحب کی وفادار رعایا ہوں۔ اُن کا غلام ہوں۔"

"کیا سچ مچ تمہیں کسی پر غصّہ نہیں آتا؟" رشید نے تیز نگاہوں سے ویکسی نیٹر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

ویکسی نیٹر گھبرا سا گیا۔ آنکھیں نیچی کر کے بولا۔ "نہیں ہرگز نہیں۔ میرا دِل صاف ہے۔ لیکن دوست ......" اب ویکسی نیٹر نے اپنی نگاہیں نگاہیں اُوپر اُٹھالیں اور رشید کی طرف مجوب نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگا۔ "میں ایک بات تم سے کہنا چاہتا ہوں۔ اور اسے کہتے وقت میرا سینہ پھٹا جاتا ہے۔ اور میں یہ بات تم سے کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ اور وُہ بات جاگیردار صاحب کے اِس پُرانے محل کے بُرجوں کے متعلق ہے۔ میں انہیں دھوپ میں سونے کی طرح چمکتے ہوئے دیکھ کر بار ہا پاگل ہو جاتا ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وُہ مجھ پر ہنس رہے ہیں۔ میرا منہ چڑا رہے ہیں۔ میں اُنہیں صاف

صاف صاف کہتے ہوئے سنتا ہوں۔ تم ہمیں نہیں جانتے۔ ہم اب بھی تمہاری دُنیا کو تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔ تمہارے امن و سکون کو خس و خاشاک میں ملا سکتے ہیں۔ تمہاری زندگی کی خوشیوں کو پاؤں تلے روند سکتے ہیں۔ تم ہمیں نہیں پہچانتے۔ ہا ہا ہا۔"

اور میں پاگل ہو جاتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ جب تک یہ چمکتے ہوئے برج موجود ہیں۔ میرے دِل کو اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔ بارہا میرے دِل میں خیال آتا ہے کہ ایک دو پیسے کا بارود لے کر میں رات کے وقت اِس پُرانے محل کے قریب جاؤں اور بارود لگا کر بھک سے اِن بُرجوں کو اُڑا دوں تو..... تو..... لیکن میں نے ہر بار اِس موذی خیال کو دِل میں زور سے دبا دیا ہے۔"

اور ویکسی نیٹر نے رازدارانہ لہجہ میں رشمی کی طرف جُھک کر کہا۔

"لیکن ایک دن میں اِس کام کو ضرور پُورا کر کے چھوڑوں گا۔ ......"

خونی ناچ

خونی ناچ

دوسرے دن عید تھی اور میں پانچ دن کی رخصت لیکر گھر جا رہا تھا۔ ایک ٹرنک اور ایک گٹھڑی جس میں گوجرانوالے کے سرخ مالٹے اور بچوں کے لئے کچھ کھلونے بندھے تھے۔ بس یہ مختصر سا سامان تھا جسے میں نے لاہور اترتے ہی کرایہ کے سالم تانگے پر لدوالیا۔ اور خوشی خوشی گھر چلا۔ کل عید بھی تھی۔ اور پھر خالہ اور خالہ کی لڑکی رفعت بھی آئی ہوگی۔ رفعت کی بڑی بڑی آنکھوں کی ملامت اور اس کے محجوب سے لبوں کی مسکراہٹ بار بار گویا آنکھوں کے آگے آکر کہہ رہی تھی۔ "اوہ بھائی جان! — آپ بھی آگئے۔ اب شودھنا کا خونی ناچ دیکھنے میں خوب لطف آئے گا۔" جب سے میں نے گوجرانوالہ میں شودھنا کے رقص کے متعلق اخبار میں مضامین پڑھے تھے۔ بس یہی سوچ رہا تھا کہ عید ہوگی

اور رفعت اور میں اور شور دھنا کا خونی ناچ۔ رفعت، رفعت، کتنا خوبصورت نام ہے اور مردانہ نام ہو تو عارف۔ عتیق۔ محبوب کچھ بھی ہو۔ لیکن صابر، صابر ــــ یہ نام تو ایسا ہے، جیسا کسی چمڑا بیچنے والے دکاندار کا۔ یکایک میونسپلٹی کی سڑک کے ایک گڑھے نے تانگے کو وہ ہچکولا دیا کہ گھوڑا گرتے گرتے بچا۔ اور مجھے تو گویا دن میں تارے نظر آگئے۔ اب تانگے والے کے منہ سے ایسی نئی "بطرز جدید" قسم کی گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہوئی کہ میں رشک و حیرت سے اس کے منہ کی طرف تکتا رہ گیا۔ میں نے سوچا کیا روانی ہے، زبان میں کس قدر لوچ ہے۔ کیسی لچھے دار تشبیہیں، کاش یہ تانگے والا ادیب ہوتا۔

شاہ عالمی سے لے کر لوہاری دروازے تک میونسپل باغ کے لکڑی کے جنگلے پر پرانے گرم کوٹ لٹکے ہوئے تھے اور ہر دس قدم کے فاصلے پر دو تین کابلی پٹھان فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ لیکن وہ اس وقت گرم کوٹ نہیں بیچ رہے تھے بلکہ تانگے والے کے منہ سے لاہور میونسپلٹی کے متعلق تعریفی کلمات اور شاعرانہ مبالغہ آرائیاں سن سن کر حیران ہو رہے تھے۔ سینیلا منڈے کے قریب تانگے والے کو ذرا رک جانا پڑا۔ یہاں بہت بھیڑ تھی۔ بہت سے لوگ جمع تھے اور دو چار پولیس کے جوان بھی۔ ایک حادثہ ہو گیا تھا۔ شرط بد کر بھاگنے والے دو تانگے آپس میں ٹکرا گئے تھے۔ اور ایک مزدور جو بستر اٹھائے ہوئے آگے دوڑا جا رہا تھا،

اِن دو تانگوں کے بیچ میں آکر بُری طرح کچلا گیا تھا۔ اِس کی خُون میں لتھڑی ہُوئی لاش سڑک پر پڑی تھی اور بستر کا مالک اپنی دھوتی سنبھالتے ہُوئے تانگے والوں کی بدمعاشی، گاڑی سے لیٹ ہو جانے کا اور بستر کے لہُو سے لت پت ہو جانے کا بلند اور کرخت آواز میں ذِکر کر رہا تھا۔ لمبی لمبی مُونچھوں کو سائیکل کے ہینڈل کی طرح موڑ کر رکھنے کا شوقین سپاہی ہنٹر ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا: "یہ سب اِن تانگے والوں کی بدمعاشی ہے۔"

دُوسرا سپاہی بولا: "اپنا نام لکھاؤ لالہ جی۔"

مجمع میں مختلف آوازیں اُٹھ رہی تھیں۔ "اوہو اوہو، بچ بچ بچ، مرگیا بیچارہ۔" "گھوڑے بھی زخمی ہو گئے۔" "کم بخت تانگے والے کو کوئی چوٹ نہیں آئی!" "مگر دیکھئے اِس تانگے والے کا تو کم سے کم سَو روپیہ کا نقصان ہو گیا۔" "اُف!"

تانگے اور موٹریں، لاریاں اور چھکڑے جمع ہو گئے۔ دیکھتے دیکھتے شاہ عالمی تک راستہ بند ہو گیا۔ آخر مُشکل سے میرے تانگے والے نے بڑ کے درخت کے قریب "ہٹو مہربان۔ لالہ جی ایک طرف، خان صاحب، سنتری جی۔ سائیں جی، او مائی بچ جا" کہہ کر راستہ نکالا اور پھر گھوڑے کو جو چابک دکھایا تو لوہاری کے چوک میں پہنچ گیا۔ خوانچے والوں کی صدائیں۔ انار کلی کے اندر گذرتے ہُوئے تانگے میں دلفریب ساڑیوں کی جھلک۔ "یہ لاہور ہے۔" اور سینما والوں کی اشتہار گاڑیاں عید کی خوشی میں خاص پروگرام، ریجنٹ میں "نورِ اسلام" کراؤن میں "بانکی اُلفت" الفنسٹن میں "شاہی لٹیرا" راکسی

ہیں "شانِ قلندر"۔ پربھات میں شودھنا کا ناچ۔"

"شودھنا کا ناچ اور رفعت!"

بھاٹی دروازے پہنچ کر میں نے تانگے والے سے کہا۔ "مجھے یہیں اُترنا ہے۔"
ایک مزدور نے دوڑ کر میرا اسباب اُٹھایا اور فٹ پاتھ پر رکھ دیا۔ تانگے والے نے چار آنے لیکر گھوڑے کا رُخ لوہاری دروازے کی طرف موڑ دیا۔ اور قریب کی ایک دوکان سے پان لینے چلا گیا۔ مزدور بولا۔ "اسباب اُٹھاؤں جی!"

"اُٹھاؤ۔ ذیلدار روڈ پر لے چلو۔ یہاں سے قریب ہی تو ہے، ایک آنہ دیں گے۔"

کچھ جواب دیئے بغیر ہی نوجوان مزدور نے بستر اور گھٹڑی اُٹھا لی۔ اور ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں نے یونہی پوچھا۔ "ذیلدار روڈ کا راستہ جانتے ہو؟"

"جی نہیں، نیا نیا آیا ہوں۔" اِس کا لہجہ نہایت خوشگوار اور دیہاتی تھا۔ شہری تصنّع سے بالکل پاک۔"

"کہاں سے آئے ہو؟"

"مُلتان سے۔"

"خاص مُلتان سے؟"

"جی نہیں، مُلتان کے پاس پاروال گاؤں ہے۔ وہاں سے آیا ہوں۔ پہلے لائل پور گیا تھا۔ پھر اُدھر سے لاہور آگیا ہوں۔"

"کیا لائل پور میں اچھی مزدوری نہیں ملتی؟"

"مزدوری تو ملتی تھی۔ مگر بات یہ ہوئی کہ میں اور میرا بڑا بھائی ہم چار بھائی ہیں۔ میرے تین بڑے بھائی بیاہے ہوئے ہیں۔ مگر میں کنوارا ہوں۔ دو بڑے بھائی تو پاردوال میں کاشت کرتے ہیں۔ زمین تھوڑی ہے۔ گزارہ نہیں ہوتا۔ مجھ سے بڑے بھائی کا پچھلے سال بیاہ ہوا ہے ہم دونوں بھائی مزدوری کے لئے ملتان سے لائل پور منڈی آئے تھے اور ایک دن جب ہم گھنٹہ گھر کے قریب ستادہ تھے۔ ہمیں ایک بابو ملا۔ اس نے کلاہ پر لنگی باندھ رکھی تھی۔ ہم سے پوچھنے لگا "مزدوری کرو گے؟" ہم نے کہا کریں گے! بولا "یہاں کیا لیتے ہو؟" ہم نے کہا۔ "آٹھ آنے روزانہ۔" کہنے لگا۔ "میں بارہ آنے روزانہ دوں گا۔ لیکن تمہیں ملکوال میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔" ہم نے سوچا چلو مزدوری تو اچھی ملتی ہے۔ ہم ملکوال چلے گئے۔ وہاں سے وہ بابو ہمیں سدھووال لے گیا۔ راستے میں ہمیں تسلی دیتا گیا۔ کہ بڑا آسان کام ہے۔ بس یہی دیواروں پر سفیدی وغیرہ کرنا۔ اس سے پہلے ہم نے سفیدی تو نہ کی تھی۔ لیکن سوچا۔ اس میں کیا ہے، کر دیں گے۔ سدھووال جا کر اس نے ہمارے ہاتھوں میں ایک ایک کدال تھما دی اور ریلوے لائن پر لے گیا۔ اور کہا۔ اس کے ساتھ ساتھ زمین کھودنی ہے۔ اور جتنے فٹ زمین روز کھودو گے اس کے حساب سے تمہیں پیسے ملیں گے۔ اس حساب سے ہمیں بمشکل چار آنے روز ملتے تھے۔ اور زمین

کھوڑو نے کھوڑتے ہمارے ہاتھ اور بازو وشل ہو گئے۔ ایسی سخت تبی تھی وہ۔ آخر ایک دن رات کو ہم دونوں بھائی بھاگ نکلے۔ اس سے ہمیں بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ ہمیں دن بھر گالیاں دیتا رہتا تھا۔ اور اکثر پیٹ بھی ڈالتا تھا۔ پھر ہم یہاں آ گئے۔ یہاں ہم صبح کو منڈی جاتے ہیں۔ وہاں بارہ بجے تک چار آنے ہو جاتے ہیں۔ پھر ہم دن بھر ادھر اُدھر گھوم کر مزدوری کرتے رہتے ہیں۔ بہت ہُوا تو کسی دن آٹھ نو آنے بن گئے۔ لیکن عام طور پر پانچ چھ آنے سے زیادہ روزانہ کمائی نہیں ہوتی۔"

مَیں نے پُوچھا ـ"تم رات کو رہتے کہاں ہو؟"

"جی داتا کے دربار میں۔"

"وہاں جگہ ہے؟"

"مجاوروں کی مہربانی سے رات بسر ہو جاتی ہے۔ اور پھر ہم انہیں خوش بھی کر دیتے ہیں۔"

"اچھا؟"

"جی!"

اب میرا گھر سامنے آ گیا تھا۔ ننھا عبید سامنے مٹی میں کھیل رہا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھ لیا۔ اور وہ دیکھتے ہی اپنی توتلی زبان میں چلّا اُٹھا ـ "بھائی جان آ دیئے۔" اور یہ کہتا ہُوا دَوڑ کر اندر چلا گیا۔

دالان میں پہنچ کر مزدور نے بستر اور گٹھڑی فرش پر رکھ دی۔ اور

ایک طرف کھڑا ہو کر پسینہ پونچھنے لگا۔ اب گھر کے سب لوگ میرے گرد جمع ہو رہے تھے۔ اور پُر مسرت نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ننھا عبید اور منجھلا بھائی، اماں، خالہ اور رفعت (رفت کی نرم مُسکراہٹ اور رفعت کی مہربان نگاہیں۔)

منجھلے بھائی بولے: "ہم تو صُبح کی گاڑی سے آپ کا انتظار کر رہے تھے؟"

اماں بولیں: "رفیع کی نانی اب تو اچھی ہیں نا؟"

رفعت نے ہنستے ہُوئے کہا: "بھائی جان ہم تو آج ہی شیودھنا کا ناچ دیکھنے کی تیاری کر رہے ہیں!"

مزدور کونے میں سے بولا۔ "مجھے پیسے جلد دیجئے میرا بھائی انتظار کر رہا ہوگا۔ وہ ابھی ابھی شاہ عالمی تک ایک لالہ کے ساتھ بستر اُٹھا کر گیا ہے۔ اور اب واپس آکر داتا جی کے دربار میں انتظار کر رہا ہوگا" پھر مُسکرا کر کہنے لگا: "کچھ انعام بھی مِل جائے۔ کل عید ہے بابو جی۔"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور پھر یکایک میرا ہاتھ رُک گیا۔ میرا سارا جسم کانپنے لگا۔ میری آنکھوں کے گرد زمین و آسمان گھومنے لگے۔ رفعت کی مُسکراہٹ پھیلتی ہُوئی ساری فضا میں عجیب حلقے بناتی ہُوئی دکھائی دی۔ شیودھنا کے رقصاں پاؤں میں بندھے ہُوئے گھنگھرو زور زور سے چیخنے لگے۔ ساری کائنات لرز رہی تھی۔ انار کلی میں گزرتے ہُوئے تانگے دلفریب ساڑیوں کی بہار دکھاتے ہُوئے فضا میں لڑھکنے لگے۔ اب چاروں

خون ہی خون تھا۔ اور وہ پتھرائی ہوئی آنکھیں اس میں سے باہر جھانک رہی تھیں اور کوئی لاکھوں کروڑوں مکھیوں کے بھنبھنانے کی گونج کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ "اے ہے، چچ چچ بے چارہ مر گیا......"

دل کا چراغ

دل کا چراغ

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی تو چار بجے تھے اور خواب گاہ کی کھڑکی کے سامنے سڑک کے اُس پار سکھ دوکاندار کی دوکان سے سُکھ منی جی کے پاٹھ کی آواز آ رہی تھی۔ لہجے سے صدق، عجز، اور پاکیزگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ لیکن آواز ذرا منجھی ہُوئی تھی۔ اِس لئے برابر چلی آ رہی تھی۔ ایسی آواز جو اپنی پاکیزگی کے باوجود میرے کانوں کو تیز معلوم ہُوئی۔ گویا کہہ رہی تھی۔ مردُود تجھے اپنے خالق کا کچھ پاس نہیں۔ کیسی میٹھی نیند سو رہا ہے۔ شرم نہیں آتی تجھے۔ دیکھ ستارے ماند پڑ رہے ہیں۔ مشرق سے روشنی پھُوٹ رہی ہے اور اپنے قادرِ مطلق کی تعریف کا گیت بن کر آسمان کی طرف اُٹھ رہی ہُوں۔ اُٹھ، اُٹھ، بے شرم، کافر، ملحد، دہریئے، آواز اونچی ہو رہی تھی۔ تھرّاتی ہُوئی، لرزتی ہُوئی۔ گویا اپنے آپ کو ربِ عظیم کے

آستانے پہ نچھاور کرتی ہوئی میری کھڑکی کے اندر چلی آ رہی تھی۔ میں نے نیند سے بھرے ہوئے پپوٹوں کو اُٹھائے بغیر ہی کھڑکی کے پردے گرا دیئے۔ کھڑکی بند کر دی۔ اور لحاف مُنہ اور سر کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر سو گیا۔ لیکن میرے اللہ۔ وُہ آواز ابھی تک آ رہی تھی اور اب تو گویا چلا چلا کر کہہ رہی تھی۔ "اُٹھ، اُٹھ۔ اُٹھ فریدا ستیا تے من دا دِیوا بال۔" (اے سوئے ہوئے فرید، اُٹھ، اور دِل کا چراغ روشن کر دے)

گو میرا نام فرید نہیں۔ لیکن پھر بھی مَیں نے اب یہی مناسب سمجھا کہ بستر پر اُٹھ کر بیٹھ جاؤں اور میز پر پڑے ہوئے ٹیبل لیمپ کو روشن کر دُوں۔ جب کمرے میں اُجالا ہو گیا تو روشنی اور آواز دونوں نے مِل کر نیند کا میٹھا تسکین وُہ خمار میری آنکھوں سے بالکل دُور کر دیا۔ اب مجھے آنکھوں میں ایک جلن اور چبھن سی محسوس ہو رہی تھی۔ اور ایسا معلُوم ہُوا۔ کہ یہ آواز نہ تھی بلکہ سُوئیاں اور کانٹے تھے جو میری آنکھوں میں چُبھ رہے تھے۔ مَیں نے آنکھیں ملتے ہُوئے کھڑکی کھول دی۔ ایک لرزتی ناٹے دار آواز آئی۔

اُٹھ فریدا ستیا تے من دا دیوا بال
صاحب جنہاں دے جاگدے نفراں کی سونے نال

(اور جب تیرا صاحب جاگ رہا ہو تو اے بیرے کے بچے تجھے سونے کا کیا حق ہے)

بالکل دُرست، پیر و مُرشد، بالکل دُرست۔ آج کی خطا معاف ہو۔ کل اگر چار بجے سے پہلے ہی نہ اُٹھوں تو پھر — بھلا آپ کی آواز ہی مجھے کیوں چین لینے دیگی۔

مَیں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو سامنے سکھ دُکاندار کی دُکان پر کوئی

جھاڑ دے رہا تھا۔ ٹین کے ڈبوں کو جھاڑ کر اپنی جگہ رکھ رہا تھا۔ آٹے اور دال کی بوریوں کو اُٹھا اُٹھا کر قرینے سے سجا رہا تھا۔ یہ وہ بے چارہ کہ تازہ تازہ زردرُو سکھ دوکان دار تو نہ تھا۔ یہ تو کوئی اور تھا۔ شمع کی ہلکی سی لَو میں اس کی لمبی پرچھائیں، اِس کا چُست پاجامہ اور کاندھوں کے گرد لپٹا ہُوا کھیس نظر آ رہا تھا یا پھر وُہی صدا سے برحق۔

گُن گا دیں تے من بھا دیں (اپنے گورُو کی تعریف کر۔ تاکہ تُو اِس کے دِل میں گھر کر سکے)

جی!

گُن گا دیں تے من بھا دیں۔

جی!

جی! بالکل دُرست۔ پیرو مُرشد، بالکل دُرست۔ اگر میں اپنے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ کی دِن رات خوشامد نہ کرتا تو آج محض ایک ایف۔ اے فیل ہو کر چھپّن روپے تنخواہ نہ پاتا۔

"جی، ست سری اکال!" اب وُہ لمبی پرچھائیں دکان کے باہر آ گئی تھی جبکہ نعرے نے گورُو نانک نگر کے در و دیوار ہلا دیئے تھے۔ وُہ نعرہ میری کھڑکی کھُلی دیکھ کر ہی لگایا گیا۔

"آہا، بابُو جی۔ آج تو آپ بڑے سویرے" اُٹھ بیٹھے۔ لمبی پرچھائیں نے کہا۔

مَیں نے مُسکرانے کی کوشش کی۔

"بابُو جی، سویرے اُٹھنا بہت اچھا ہوتا ہے۔ اب تو خیر بہت اُجالا ہو گیا ہے۔

میں نے آسمان کی طرف نگاہ اُٹھائی۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ ابھی تو چار ہی بجے تھے، ستارے چمک رہے تھے۔ اور بجلی کے کھمبوں پہ قمقمے بھی۔ اُجالا کہاں ہے۔ میں نے سوچا۔ پھر خیال آیا کہ یہ معرفت کی باتیں ہیں۔ تو بے وقوف اِنہیں کیا جانے۔ جس کے دل میں اُجالا ہوتا ہے اُسے ہر طرف سے اُجالا ہی اُجالا دکھائی دیتا ہے۔

میں نے پوچھا، یہ ـــــ دُکان کے ـــــ نند سنگھ جی کہاں ہیں؟

گھر پر ہی ہیں جی۔ وُہ تو ابھی سوئے ہوں گے جی۔ میں نے سوچا چلو، ان کے گھر مہمان بن کر آیا ہُوں تو کچھ سیوا ہی کر لُوں۔ کر سیوا، کھا میوہ۔ میرا نام درشن سنگھ ہے جی۔ میں نند سنگھ جی کے بڑے سالے کا بڑا لڑکا ہُوں۔ جی۔ میں نُور پور میں گرنتھی ہُوں۔ نند سنگھ جی ذرا بیمار رہتے ہیں۔ اُنہیں مرگی کا دَورہ پڑتا ہے۔ آپ کو تو پتہ ہی ہوگا۔ واہگورو مہاراج سب کا بھلا کرے، تو ـــــ اُنہوں نے مجھے یہاں بُلا لیا ہے۔ ذرا دُکان کے کام کاج میں مدد ہو جاتی ہے۔ میں یہیں دُکان پر سو یا کرُوں گا۔ واہگورو۔ واہگورو۔ اب تو دن چڑھ گیا ہے۔ او بنئے او بنئے اُٹھ دوکان کھول۔ کیا دیکھتا ہے۔ دِن کبھی کا نکل آیا۔

درشن سنگھ بنئے کو آوازیں دینے لگا۔ بے چارہ بنیا اِس مکان کی نچلی منزل میں جہاں میں رہتا ہُوں آٹا، نُون، تیل، سبزی، سوڈا واٹر اور پکوڑے بیچتا ہے۔ اِس کی بیوی کا رنگ ذرا کھلتا ہُوا سا ہے۔ اور وُہ ہمیشہ مَینا کی طرح چہکا کرتی ہے۔ دُکان پر کام کرتی ہے۔ گاہکوں کو مُسکرا کر سودا دیتی ہے۔ نگر کے کنوارے لڑکے، بدصُورت بیویوں کے ادھیڑ خاوند، بوڑھے،

دھوبی، نائی، موچی اور اکھاڑے میں کشتی لڑنے والے پہلوان سبھی بنئے کی دکان سے سودا لیتے ہیں۔ کرسی پر بیٹھ کر پکوڑے کھاتے ہیں۔ بڑی رغبت سے، یا بنیئے کی بیوی سے، سوڈا واٹر کی ایک بوتل کھول دینا" اور آج تو بنیائن خوب بنی ٹھنی ہے۔ ہی ہی ہی ......"

اور بنیئے کی بیوی بوتل سے کاگ اُڑاتے ہوئے کہتی ہے۔ "ہٹ مردود"

....

دوسرے دن درشن سنگھ کے پہلے مصرعے نے ہی مجھے جگا دیا۔ گھڑی کی طرف دیکھا تو کم بخت پورے چار تھے۔ میں نے سوچا۔ یہ آدمی ہے یا گھڑیال۔ میں نے لحاف میں منہ چھپا کر اپنی بدبختی پر رونے کی کوشش کی، لیکن جلتی ہوئی آنکھوں میں آنسو کیسے آتے۔ میں نے درشن سنگھ کو، اس کے آباؤ اجداد کو، اپنی قسمت کو، فرید بابا کو لاکھ لاکھ کوسنے دیئے۔ اتنے میں میں نے سنا کہ نچلی منزل سے بھی ایک ہلکی ہلکی صدا اُٹھ رہی ہے۔

اوم جے جگدیش ہرے۔

جے جگدیش ہرے اے اے ......

بنیا اپنی پھٹے ہوئے ڈھول کی سی آواز میں گا رہا تھا۔ وہی صدق، عجز اور پاکیزگی۔ لیکن خاص قسم کی تیزی جو گویا درشن سنگھ سے کہہ رہی تھی، تم ہمیں کیا سمجھتے ہو۔ ہم تم سے ہیٹے نہیں ہیں۔ ہمیں بھی اپنا بھگوان کچھ کم پیارا نہیں۔

° اونہہ!

اور اب بنیا اور اُس کی بیوی اور دونوں بچے اپنی ملی جلی آوازوں کے ساتھ کہہ رہے تھے۔

بھگت جنن کے سنکٹ چھن میں دور کرے۔ (وہ اپنے بھگتوں کے دُکھ ایک پل میں دُور کر دیتا ہے۔)

اوم

جے جگدیش ہرے ا رے ا رے۔

اور بنیے کی بیوی کوئل کی کُوک کُوک کر کہہ رہی تھی۔

تُم بن اور نہ دُوجا۔

تُم بن اور نہ دُوجا۔

آس کروں میں جس کی

اوم جے جگدیش ہرے

ایک درمیانی وقفے میں درشن سنگھ نے خوش ہو کر بنیے سے اونچی آواز میں کہا۔ "بنیا جی، آہا واہگورو کا نام لینے میں کتنا آنند ہے"۔ بنیے نے پُر خلوص لہجے میں کہا، آہا، رام کی مہما۔ اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

....

درشن سنگھ کے آتے ہی نگر میں دھوم کرم کے چرچے ہونے لگے۔ یہ نگر لاہور ہی کی آبادی کا ایک حصّہ تھا۔ یہاں اِس لئے کوئی خاص مذہبی مجلسیں قایم نہ ہوتی تھیں۔ سے نے کہ ایک سنگھ سبھا تھی جس

کا اجلاس سال میں شاید ایک مرتبہ ہی ہوتا تھا۔ جس مکان میں میں رہتا تھا۔ اُس سے بس دس پندرہ قدم آگے جاکر مغرب کی طرف ایک مُسلمان قلعی گر، ایک مُسلمان رنگساز، ایک مُسلمان حکیم اور ایک مُسلمان سبزی فروش کی دُکانیں تھیں۔ اِن سے آگے کھُلی جگہ تھی جہاں اکھاڑہ بنا ہُوا تھا۔ یہاں سِکھ، مُسلمان، ہندو اور چمار پہلوان سب اکٹھے ہو کر کُشتی لڑا کرتے تھے۔

لیکن درشن سنگھ کے آتے ہی دِلوں میں گویا صِدق و ایمان کی رُوح پھُونک گئی۔ ست سری اکال اور اوم جے جگدیش ہرے کے بعد مُسلمان رنگساز نے یہ مناسب سمجھا کہ نورِ ایمان مُردہ دِلوں میں تازہ کیا جائے۔ چنانچہ اب کچھ دِنوں سے اِس کی دُکان پر ایک سبز منکوں والے اور سبز چُغے والے پیر جو ہر وقت پیر اور مولوی اور عامل بھی تشریف لانے لگے۔ اب رنگساز کی دُکان پر ہمیشہ ایک جمگھٹا سا لگا رہتا تھا۔ اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوتی تھیں اور سائیکلوں کے مستری کے نوجوان لڑکے یا علی یا علی کرتے اور خوشی سے ناچتے ہُوئے گزر جاتے تھے۔ مُسلمان سبزی والے کا تمباکو کا خرچ بڑھ گیا تھا۔ اور حکیم صاحب ایک دن اپنے چھوٹے لڑکے کو بنیے کی دوکان پر پکوڑیاں کھاتے دیکھ کر غصّے میں آکر پیٹنے لگے۔

پھر جب غصّہ ٹھنڈا ہُوا تو بولے ــــ "یہ کم بخت ہمیشہ گندی چیزیں کھاتا ہے۔ میں نے اِسے سَو بار سمجھایا ہے!"

چند روز کے بعد جب میں ایک شام کو دفتر سے تھکا ماندہ واپس آرہا تھا۔ تو کیا دیکھتا ہُوں کہ نگر کا بازار جھنڈیوں سے سجا ہُوا ہے۔ اور

بازاروں میں سنگھ سبھا کے والنٹیر ٹولیاں بنائے جگہ جگہ کھڑے ہیں۔ جن میں سے کئی ایک نے گلے میں ہار پہن رکھے ہیں۔ اکثر لوگ پان چبا رہے ہیں۔ ننھے ننھے سکھ لڑکے بھی کرپانیں پہنے ہوئے ہیں۔ اور اُبلے ہوئے چنے کھا رہے ہیں یا کھٹے کچالو یا پلیٹوں میں جمی ہوئی سُرخ سُرخ چینی گھاس کی کھیر۔

درشن سنگھ نے مجھے دیکھتے ہی ست سری اکال کا جےکارہ لگایا۔

آہا" بابو جی، آج باباجی رہا ہو گئے۔"

"کون سے باباجی؟"

"واہ۔ آپ کو بھی پتہ نہیں، آپ تو روز اخبار پڑھتے ہیں۔ وُہی واہگورو جی کے سچے خالصہ بابا ٹیک سنگھ جی۔"

بنیئے کی دُکان پر کھڑے ہوئے ایک والنٹیر نے کہا" زندہ شہید بابا ٹیک سنگھ جی رہا ہو گئے ہیں۔ آج ہم اُن کو ایڈریس دیں گے۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے۔" مَیں نے کہا۔

ساتھ والے مسلمان قلعی ساز کی دُکان پر شہید گنج کا مسئلہ چھڑا ہوا تھا اور گرماگرم بحث ہو رہی تھی۔

دُوسرے دن میری نیند روز کی طرح اُچاٹ ہو گئی۔ لیکن باقی آوازوں کے ساتھ ہی ایک ریکارڈ بھی بج رہا تھا۔ مکان کے دُوسرے حصّے میں میری طرح ایک اور کرائے دار رہتا تھا، میری ہی طرح ایک دفتر میں ملازم تھا۔ اور اب وُہی مُنہ اندھیرے اُٹھ کر ریکارڈ بجا رہا تھا۔

نو بجے کے قریب وُہ مجھے سیڑھیوں پر ملا۔ مَیں نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے

ساتھ اِس سے کہا۔ "آج تو آپ صُبح ہی اُٹھ بیٹھے۔"

"ہو ہو ہو۔" بابوجی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہا ہا ہا! مجھے مہاتماجی کا ریکارڈ بہت پسند ہے۔ آپ کو پتہ ہے مہاتماجی کو یہ گیت خاص طور پر پسند ہے۔"

"کونسا گیت؟"

"یہی جس کا میں صُبح ریکارڈ بجا رہا تھا، "اُٹھ جاگ مُسافر بھور بھئی۔" کیسا میٹھا گیت ہے۔ اِسے صُبح سُن کر طبیعت بشاش ہو جاتی ہے۔"

اور پھر وُہ یہ گنگناتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔

"اُٹھ جاگ، اُٹھ جاگ مُسافر بھور بھئی، اب رین کہاں جو سووت ہے۔

اسے، اسے۔"

. . . .

پرسوں ایک حادثہ ہو گیا تھا۔ گوشت سے بھرے ہُوئے چھکڑے یا تانگے بُوچڑ خانے سے آتے ہوئے اِسی طرف سے گذرتے ہیں۔ میونسپلٹی کی سڑک پر بہت سے گڑھے پڑ جانے کی وجہ سے اکثر چھکڑوں کے بیل یا تانگوں کے گھوڑے چوٹ کھا کر گر پڑتے ہیں۔ اور کئی بار گوشت بھی زمین پر گر جاتا ہے۔ چنانچہ پرسوں بھی ایک تانگہ سِکھ دُکاندار کی دُکان کے سامنے اُلٹ گیا۔ اور گوشت دُکان کے قریب زمین پر گر پڑا۔ تانگے والے کو بہت سی چوٹیں لگیں۔ چنانچہ پرسوں شام ہی کو "پریم سبھا" کے سیکرٹری میرے پاس آئے۔ اور بولے۔

"اِس کا ندارک ہونا چاہیئے۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے، میونسپلٹی کو لکھ دیجئے۔"

بولے۔ "نہیں۔ آپ میری بات نہیں سمجھے۔ یہ راستہ ہی بوچڑوں کے لئے بند ہونا چاہیئے۔ یہ ہندو سکھ آبادی ہے۔ ہماری توہین ہوتی ہے۔ ہمارے جذبات کو ٹھیس لگتی ہے۔ اسکے علاوہ آپ دیکھئے نا۔ یہاں چھوٹے بچے، لڑکے بالے گھومتے رہتے ہیں۔ اگر کسی کے چوٹ لگ جائے، اگر کوئی مر جائے تو۔۔۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو درست ہے لیکن بوچڑ خانے کا بھی تو یہی راستہ ہے اور۔۔"

پریم سبھا کے سیکرٹری بولے۔ "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ ہمیں اخبار میں خبر بھیجنے کے لئے ایک مسوّدہ بنا دیجئے۔"

میں نے کہا۔ "یہ پریم سبھا کب بنی ہے؟"

وُہ بولے۔ "تین چار دِن ہُوئے یہاں چار پانچ ہندوؤں نے مِل کر بنائی ہے۔ آپس میں مِل بیٹھنا اچھا ہوتا ہے۔"

"پنڈت سدّھ دیو کے دو لیکچر بھی ہو چکے ہیں۔ سبھی لوگ آئے ہُوئے تھے۔ آپ کہاں رہے؟"

"میں؟" میں نے کہا۔ "کس مضمون پر لیکچر ہُوئے تھے؟"

"جاپان میں ویدک دھرم! سب سے اعلےٰ لیکچر تھا۔ پنڈت جی نے ثابت کر دیا کہ ساری دُنیا ویدک دھرم قبول کرنے کو تیار ہے، مگر ہم لوگ بہت سست ہیں۔ وُہ کہتے تھے کہ ہمیں ساری دُنیا میں اپنے پرچارک بھیجنے چاہیئں۔ انہوں نے بتایا کہ۔۔۔۔۔"

میں نے کہا۔ "میں کل آپ کو مسودہ تیار کر دوں گا۔"

دوسرے دن صبح ہی یہاں ایک فساد ہو گیا۔ ہندو، مسلم، سکھ فساد خوب گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ ساری تو آبادی میں ہراس پھیل گیا۔ اکے دکے راہگیر پر کرپانوں اور چھریوں سے حملے ہونے لگے۔ سکھوں کی کرپانوں نے، بوچڑوں کی چھریوں نے اور پوربیوں کی لاٹھیوں نے خوب دادِ شجاعت دی۔ صبح سے لیکر دوپہر تک نعرے بلند ہوتے رہے۔ پریم سبھا کے سیکریٹری نے شام ہی کو للکار کر کہہ دیا تھا کہ بوچڑوں کو اس بازار سے گذرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ بوچڑوں نے سر بازار کہہ دیا تھا کہ وہ صبح اسی سڑک پر سے گذریں گے اور ضرور گذریں گے۔ اور دیکھیں گے کہ کون مائی کا لال انہیں روکتا ہے۔"

دوسرے دن صبح ہی بوچڑ اپنے چھکڑوں اور تانگوں پر گوشت لادے ہوئے گذرنے لگے۔ سبھی خاموش تھے کسی کی ہمت نہ پڑی کہ انہیں روکتا کہ اتنے میں درشن سنگھ نے للکارا۔ "ٹھہر جاؤ۔" اور کرپان لیکر میدان میں آگیا۔

مسلمان رنگساز نے کہا۔ "اللہ ۔۔۔ ہو ۔۔۔ اکبر۔"

بنیا جلد جلد اپنی دکان بند کرنے لگا۔ وہ اسی دکان میں اپنی بیوی اور اور دو بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ میں نے بھی نچلی منزل کا بڑا دروازہ بند کرا دیا۔ اور پھر تماشا دیکھنے کے لئے کھڑکی میں آبیٹھا، لیکن ذرا ہٹ کر۔ تاکہ کہیں کوئی اینٹ میرے ہی نہ آلگے۔

پریم سبھا کے حمایتی پوربیوں نے حملہ کر کے مسلمان حکیم اور رنگساز اور

سائیکل اور سبزی والے کی دکانیں لوٹ لیں۔ سکھ اور بوچڑ لڑ رہے تھے۔ اتنے میں گھاٹی دروازے سے کمک پہنچ گئی۔ اور مہنت نگر سے بچھڑے ہوئے ہندو بھی۔ میں نے مصلحتاً کھڑکی بند کر دی۔ میری کھڑکی پر اینٹیں پھینکی جا رہی تھیں۔ بنیئے کی دکان توڑی جا رہی تھی۔

چیخیں، دردناک ہیبت ناک چیخیں، نعرے۔ فلک شگاف نعرے۔ لاٹھیوں کے چلنے کی آوازیں۔

دکانوں کے دروازے ٹوٹنے کی آوازیں۔

دو تین گھنٹوں کے بعد یکلخت چاروں طرف موت کی سی خاموشی چھا گئی اب فساد مہنت نگر سے آگے بڑھ کر دوسرے محلّوں، نو آبادیوں اور شہر کی گلیوں کوچوں میں پہنچا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ دور، دور نعروں کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ لیکن یہاں ـــــ موت کی سی خاموشی تھی۔

میں نے چند منٹ کے سکوت کے بعد آہستہ سے کھڑکی کا پٹ کھول کر دیکھا۔

دکانیں لٹی پڑی تھیں۔ اشیاء بازار میں بکھری ہوئی تھیں۔ چند بوچڑ اور سکھ مرے پڑے تھے۔ کئی زخمی پڑے کراہ رہے تھے۔ جن میں میرا پڑوسی بنیا بھی تھا۔ اور اس کی بیوی بھی۔ جو اسے بچانے کی کوشش میں بری طرح زخمی ہو گئی تھی۔ وہ میری کھڑکی کے نیچے پڑی تھی۔ اسے اس حالت میں پڑے دیکھ کر اس کی وہ تصویر میری آنکھوں میں پھر گئی۔ جب میں نے اسے ایک دن نچلی منزل میں راکھی کے روز دیکھا تھا۔ میں دالان میں کھڑا سائیکل

صاف کہہ رہا تھا۔ کہ وہ بے تحاشا بھاگتی ہوئی آ کھڑی ہوئی۔ اس کا ہنستا ہوا چہرہ، رنگین کنارے والی دھوتی اور سڈول بازو! مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ساری دنیا خوبصورت رنگوں سے معمور ہو گئی ہے اور پھر دوسرے لمحے ہی میں وہ میرے سامنے سے غائب ہو گئی تھی۔ لیکن اس کی وہ حسین تصویر وہ رنگین پرچھائیں ایک عرصہ تک میرے آئینہ دل پر لرزتی رہی تھی۔

اور اب؟

جب میں نے پھر کھڑکی بند کی تو سائیکلوں کا بوڑھا مستری اپنے نوجوان لڑکے کی لاش کو اپنے کاندھوں پر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

. . . .

فساد کو ایک عرصہ ہو چکا ہے۔ اب یہاں امن و امان ہے۔ نجو اور ماتا دین کو پھانسی کی سزا ہو چکی ہے۔ بنیا اپنے بال بچوں کو لیکر رہتک چلا گیا ہے۔ بوڑھا مستری جس کے دونوں بچے فساد میں ہلاک ہو گئے تھے۔ اب گردن جھکائے سائیکل درست کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ درشن سنگھ کا کوئی پتہ نہیں۔ نند سنگھ نے مجھے ایک دن آہستہ سے بتایا کہ وہ آج کل نسکارپور میں گرنتھی ہے اور اب اس نے اپنا نام سکھ چین سنگھ رکھ لیا ہے۔ مسلمان رنگریز نے کہا کہ سبز جبے والا مولوی آج کل جلال پور کی مسجد میں امام ہے۔ اب آہستہ آہستہ لوگ ایک دوسرے سے اچھی طرح ملنے جلنے لگے ہیں۔ پریم سبھا کا سیکرٹری اب رادھا نگر میں رہتا ہے۔ بوچڑ لوگ گوشت کو ڈھانپے ہوئے اسی طرح سرکل پر سے گزرتے ہیں۔

سڑک پر میونسپلٹی کے گڑھے اسی طرح موجود ہیں۔ لیکن تعزیری پولیس ضرور تعینات کر دی گئی ہے۔

اب مجھے صبح چار بجے کوئی نہیں جگاتا۔ بابوجی، جو دوسرے حصے میں اب ریکارڈ نہیں بجاتے۔ کیونکہ وہ فساد میں لوٹ گئے تھے۔ اب کوئی "دل کا چراغ" روشن کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اب بالکل امن ہے۔ لیکن پھر بھی احتیاطاً اخبار میں ہر روز شکارپور اور ہلال پور کی خبریں پڑھ لیا کرتا ہوں۔

تلاش

تلاش

وہ مصوّر تھا۔ اُسے حسنِ معصوم کی تلاش تھی۔ اُس کی تلاش میں وہ سر سبز وادیوں اور آب و گیاہ میدانوں میں گھومتا رہا۔ اُس نے بڑے بڑے شہروں، چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دُور دُور کے اِکّے دُکّے گاؤں میں اُس کی تلاش کی، لیکن اُسے نہ پا سکا۔ ایک دفعہ ایک کھیت کے قریب سے گزرتے ہوئے اُس نے ایک گلاب کے حسین پھول کو دیکھا کہ باڑ سے باہر جھکی ہوئی شاخ پر بیٹھا ہوا اِس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ لیکن پیشتر اِس کے کہ مصوّر اُس کی ایک ایک پتّی کا ہلکا سا نقش ہی اُتار سکتا، ہَوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا۔ اور گلاب کی نازک پتّیاں اٹھلاتی ہوئی ہَوا کے دوش پر بکھر گئیں۔

ایک دفعہ جھیل کی نیلی خاموش سطح پر اِس نے کنول کے نوزائیدہ

پھول کو دیکھا کہ سر جھکائے پانی میں اپنا چہرہ دیکھ رہا ہے۔ خوبصورت، نازک، زرد اور سپید اور برف کی طرح پاک وصاف مصوّر نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اپنا رنگوں والا ڈبّا کھولا۔ یکایک جھیل کی خاموش سطح پر چھوٹی چھوٹی لہریں اُٹھیں، اور کنول کے پھول کی طرف بڑھتی گئیں۔ اُنھوں نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور پھر موت کے دلکش گا گاتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔

کبھی کسی گنوں گنوں کرتے ہوئے کنوئیں کے قریب سے گزرتے ہوئے مصوّر کو گمان ہوتا کہ اس نے پانی بھرتی ہوئی حسینہ کی آنکھوں میں اسے دیکھ لیا ہے۔ وہ آہستہ سے اپنی متجسس نگاہیں حسینہ کے چہرے کی طرف پھیر دیتا۔ اور عین اُس وقت کہ جب پیتل کی گاگر میں پانی رقص کرتا ہوا باہر اُچھل پڑتا، حسینہ مصوّر کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتی۔ ایسی مسکراہٹ جو گویا مصوّر سے کہہ رہی تھی ”میں تجھے صدیوں سے جانتی پہچانتی ہوں۔“ اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی بڑے شہر میں چلتے چلتے مصوّر نے سڑک کے کنارے ایک خوبصورت بچّے کو کھیلتے ہوئے دیکھا اور ٹھٹھک گیا۔ اور اُس نے بچّے کو پیار سے بلایا۔ شریر ننھے نے مصوّر کی طرف ایک چھوٹا سا پتھر کھینچ مارا۔ اور پھر اپنی جسارت پر خود ہی ہنسنے لگا۔

مصوّر کا دل پریشان ہو گیا۔ لیکن اُس نے اپنی تلاش جاری رکھی۔

. . . .

وُہ ایک صحرائی ہرنی کی طرح وحشی تھی۔ اور آسمان پر اُڑتی ہوئی ابابیل کی طرح نغمہ ریز، وُہ ہر روز جنگل میں اپنا ریوڑ چرانے جاتی تھی۔ وہاں وُہ ایک چٹان پر جو سبز کائی سے ڈھکی ہوئی تھی بیٹھ جاتی۔ گہرے سیاہ ریشم کے تاروں کی طرح نرم و نازک بال اپنے شانوں پر بکھیر دیتی اور بھیڑ بکریوں کے ننھے ننھے بچّوں سے کھیلتی رہتی۔ جنگل کے گھنے سایوں میں کہیں کہیں سورج کی کرنیں جھلملاتی رہتی تھیں۔ اور کہیں کہیں دُھوپ کے بڑے بڑے ہالوں میں چیڑ کے نکیلے جھوم کر کسی نامعلوم مسرت کے زیرِ اثر تھرتھراتے رہتے تھے۔ کبھی مشرقی ہواؤں کے لطیف جھونکے انہیں جھومروں میں بیٹھ کر دلکش گیت سُناتے تھے۔ اور پھر یکایک گیت سُناتے سُناتے تھم جاتے، کیونکہ اب وُہ چٹان پر بیٹھی ہوئی گا رہی ہوتی۔ وُہ مسرت زا نغمے بھیڑ بکریوں کے ننھے بچّوں کے لئے میٹھی میٹھی لوریاں ہوتے۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا کہ گیت سُنتے سُنتے ہوا تھم جاتی۔ پھول غنودگی میں آ کر اُونگھ جاتے اور سارا جنگل کسی نامعلوم سپنے میں کھو جاتا۔

ایک دن دوپہر کے وقت مصوّر کا گزر اِس جنگل سے ہُوا۔ وُہ چٹان پر بیٹھی تھی اور اپنی گود میں ایک بھیڑ کے بچّے کو لئے ہوئے اس سے کھیل رہی تھی۔ وُہ کبھی اُسے دُور اُوپر ہوا میں پھینک دیتی۔ اور پھر باہیں پھیلا کر جھیلتے ہوئے بچّے کو اپنی آغوش میں لے لیتی اور اِسے زور سے اپنی چھاتی سے لگا لیتی۔ اور کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔

مصوّر نے لڑکی کو دیکھا اور ٹھہر گیا۔ اور بہت دیر تک اُسے دیکھتا رہا پھر

کہنے لگا "اِدھر ـــ میرے قریب آ کر بیٹھ جاؤ۔ مَیں تمہارے لئے ایک نہایت خُوبصورت تصویر بناؤں گا۔"

وحشی لڑکی نے حیران نگاہوں سے مصوّر کی طرف دیکھا۔ پھر اُس نے ایک خفیف سی جُنبش کے ساتھ سر کو جھٹکا دیا اور مصوّر کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

دِن گذرتے گئے۔ مصوّر بہت خُوش تھا۔ تصویر آدھی سے زیادہ مکمل ہو چکی تھی۔ چند دِنوں میں وُہ اِسے مکمل کر لے گا۔ اور پھر تصویری دُنیا میں اِس لافانی شاہکار کو پیش کر کے شہرتِ دوام حاصِل کرے گا۔

اور گاؤں میں لڑکی ناچ ناچ کر اپنی ہمجولیوں سے کہتی "وُہ میرے لئے ایک تصویر بنا رہا ہے۔ ایک نہائت اچھی، خوبصورت تصویر۔ آہاہا، کتنی اچھی تصویر ہو گی۔ اور پھر وُہ باہیں پھیلا کر اپنے ناچتے ہوئے قدموں پر گھوم گھوم جاتی۔ آہاہا۔ آہاہا۔ اِس پر گاؤں کی بڑی بُوڑھی عورتیں ایک مفہمی انداز میں مسکرا دیتیں۔ اور نوجوان چھوکرے کنکھیوں سے ایک دُوسرے کی طرف دیکھ کر چُپ ہو رہتے۔

. . . .

ایک دِن جب وُہ صُبح کے وقت ریوڑ کو گلے سے باہر نکال رہی تھی، ایک نوجوان چھوکرے نے اُس سے پُوچھا "کیا تمہیں پتہ ہے لیلیٰ کہ وُہ تمہاری ہی تصویر بنا رہا ہے؟ کیا تمہیں پتہ نہیں؟"

"نہیں تو ـــ لیکن اگر تُم چاہو تو مَیں اس سے پُوچھ سکتی ہُوں۔"

لیکن چھوکرے نے پھر سوال کیا "اور کیا تمہیں یہ پتہ بھی نہیں کہ تمہاری

تصویر کیوں بنا رہا ہے۔"

"نہیں ـــ لیکن اس نے مجھ سے کہا ہے کہ وہ تصویر بنا کر مجھے دے دیگا۔
۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔ کیا بات ہے؟"

نوجوان چرواہا ہنستے ہنستے جھک گیا۔" آہ۔۔۔۔۔اوہ۔۔۔اوہ۔۔۔۔۔۔
تمہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ تمہاری ہی تصویر ہے۔۔۔۔۔اوہ۔۔۔۔۔ بیوقوف
معصوم لڑکی۔۔۔۔۔اوہو۔۔۔۔۔۔ اوہو ہو۔ تم کس قدر بھولی بھالی ہو۔ اور
تم یہ بھی نہیں جانتیں کہ وہ تمہاری تصویر کیوں بنا رہا ہے؟ اوہو ہو!"

لڑکی پریشان ہو گئی۔ اور آج اپنی عمر میں پہلی مرتبہ وہ کسی دوسرے
آدمی کو ہنستے دیکھ کر خود نہ ہنسی۔ پھر ریوڑ کو لیکر وہ آہستہ آہستہ جنگل
کی طرف چلی گئی۔

مصوّر نے اس کی طرف دیکھ کر رُک رُک کر کہا۔ "تم آج دیر سے آئی ہو۔
اور معلوم ہوتا ہے کہ کچھ سوچ بھی رہی ہو۔"

ہاں، مجھے دیر ہی ہو گئی۔ لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ مصوّر
کی موجودگی میں ہمیشہ خوشی محسوس کیا کرتی تھی۔ راستے میں مجھے حسن ملا
تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا وہ تمہاری ہی تصویر بنا رہا ہے۔ میں نے جواب
دیا۔ مجھے پتہ نہیں۔ کیا یہ میری تصویر ہے۔ کیا میں اس تصویر میں ہوں؟"

"ہاں، لیکن تم ایسا کیوں پوچھتی ہو؟"

"اوہ ـــ یونہی ـــ لیکن میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں۔ کہ تم میری تصویر
کیوں بنا رہے ہو؟"

مصور بے چین ہو گیا۔ اس نے لیلےٰ کی طرف دیکھا۔ اور پھر چپ ہو رہا۔ اس نے محسوس کیا کہ آج اس کے ہاتھ تصویر پر جمتے ہی نہ تھے

شام کے بڑھتے ہوئے سایوں میں گاؤں جاتے ہوئے راستے میں اسے حسن مل گیا۔

"کیا تم نے اس سے پوچھا تھا؟"

"ہاں"...... اس نے کہا۔" وہ میری ہی تصویر ہے۔"

"لیکن...... کیوں؟"

"اس نے اور کچھ نہیں کہا۔"

"آہ، میں جانتا ہوں، میں جانتا ہوں حسن نے لیلےٰ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔" اسے تم سے محبت ہے، لیلےٰ، اسے تم سے محبت ہے۔ تم بہت حسین ہو لیلیٰ۔ کیا تم نہیں جانتی ہو کہ تم کسقدر حسین ہو؟ مجھے تم سے بے اندازہ محبت ہے، میری معصوم لیلےٰ، محبت، کیا تمہیں پتہ ہے کہ محبت کسے کہتے ہیں؟"

جیسے لیلےٰ کی روح کا ذرہ ذرہ صدیوں کی نیند سے جاگ اٹھا۔ کوئی اس کے دل کے دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹا رہا تھا۔ اور چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ اٹھ بھکارن دروازہ کھول دے کہ یہ معبد میرے بغیر سونا پڑا ہے۔ کوئی اس کی آنکھوں کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یکایک اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور پھر اسے ایسا معلوم ہوا گویا معبد کے دروازے کھل گئے۔ اور وہاں کھوں

کروڑوں پجاری سمندر کی لہروں کی طرح جھکولے لیتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ طوفان، بادل کی گرج، بجلی کے چمکتے ہوئے تیز دھارے اور لاکھوں گھنٹیوں کا پُرشور آواہن، لیلا یک لخت ڈر گئی۔ ایک عجیب خوف وہراس سے اِس کا سارا بدن کانپنے لگا۔ اِس نے تیزی سے اپنا ہاتھ چھُڑا لیا۔ اور بھاگ گئی۔

رات کو بستر پر لیٹے لیٹے اِس کی آنکھوں میں آنسو بار بار آئے۔ لیکن نیند ایک دفعہ بھی نہیں۔

. . . .

دوسرے دِن صُبح اُٹھ کر وہ جھیل کے کنارے گئی۔ اور دیر تک اپنا چہرہ دیکھتی رہی۔ پھر اِس نے اپنے بالوں کو دیر تک سنوارا اور دیر تک ہی اپنی نرم نرم اور سونے کی طرح حسین باہوں کو صاف کرتی رہی۔ جب وہ جھیل کے کنارے سے اُٹھی تو اُس نے اپنی باہیں پھیلا دیں اور ایک انگڑائی لے کر ہنسی۔ ایک عجیب ہنسی۔ صُبح کی پہلی کرِنوں میں اِس کے دانت موتیوں کی طرح چمک اُٹھے۔

جنگل کی طرف جاتے ہوئے راستے میں اِس نے بنفشہ کے پھولوں کا ایک گُچھا دیکھا۔ اِس نے اِسے توڑ کر اپنے بالوں میں لگا لیا۔ اب اِس کی نگاہوں میں نئی چمک تھی اور لبوں پر ایک نئی مُسکراہٹ!

جب مصوّر نے اِسے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اِس نے متوحش اور دردناک لہجہ میں پُوچھا "تم اُسے کہاں چھوڑ آئیں؟"

لیکن لڑکی کچھ نہ سمجھی۔

مصوّر اپنی جگہ سے اُٹھ کر لڑکی کے قریب گیا۔ اور اس کے شانے زور سے ہلا کر کہنے لگا: "آہ، یہ تم نے کیا کر دیا۔ تم نے اُسے کہاں چھوڑ دیا؟"

لڑکی کچھ نہ سمجھی، لیکن مسکرا دی۔

مصوّر گلوگیر لہجہ میں چلّایا: "وہ کہاں ہے؟ سچ بتاؤ وہ کہاں ہے؟ میری لیلیٰ!...... کم بخت لڑکی!......."

پھر یک لخت مصوّر نے اس کے شانے چھوڑ دیئے۔ اس نے حزیں اور شاید خشمگیں نگاہوں سے لڑکی کی نامکمل تصویر کی طرف دیکھا۔ آہستہ سے اُس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ اور اسے چوکھٹے سے باہر کھینچ لیا۔ پھر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ آہستہ سے اس نے چوکھٹے کو تہ کیا۔ رنگوں اور برشوں کے ڈبے کو سنبھالا۔ اور لڑکی پر ایک نگاہ تک ڈالے بغیر مغرب کی طرف مڑ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔

چند لمحے گزر گئے۔ لڑکی سہمی ہوئی بیٹھی رہی۔ پھر یکایک رونے لگی اور روتے روتے ہاتھ پھیلا کر کہنے لگی: "مت جاؤ، آہ! اجنبی مصوّر مت جاؤ!......"

لیکن مصوّر نے ایک مرتبہ بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ سر جھکائے ہوئے جنگل کی مغربی سمت کو جا رہا تھا۔

لڑکی پریشان نگاہوں سے کبھی آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہوئے مصوّر کی طرف، کبھی اپنی نامکمل تصویر کے ٹکڑوں کی طرف دیکھ لیتی تھی۔ لیکن وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔

ہوا پیڑ کے گیلے پتّوں میں لرزتی ہوئی سسکیاں بھر رہی تھی۔ کہیں دور جنگل میں کوئی بھیڑ کا بچھڑا ہوا بچہ چلّا رہا تھا۔ بنفشے کے پھولوں کا گچھا لیلیٰ کے پاؤں میں گر پڑا تھا۔

———— • ————

سفید پھول

"سفید پھول"

موضع مہنڈ کے موچی کا نام کبالا تھا۔ کبالا کو آج تک کسی نے گالی دیتے یا جھوٹ بولتے نہ سنا تھا۔ طبعی شرافت کے علاوہ شاید اِس کی یہ وجہ بھی تھی کہ وُہ پیدائشی گونگا تھا۔ یوں بھی تو مہنڈ کا گاؤں بدھوں کا گاؤں تھا۔ جہاں ہر ایک فرد سچائی اور اہنسا کا پجاری تھا۔ لوگ جھوٹ بہت کم بولتے تھے۔ چوری چکاری اور ڈکیتی کا نام تک نہ تھا۔ پچھلے دو سَو برس میں وہاں قتل کی ایک بھی واردات نہیں ہوئی تھی۔ لوگ مہنڈ میں اِس طرح خوش و خرم رہتے تھے جیسے جنت میں۔ یہ بات الگ ہے کہ سماج کی اُلجھنوں میں پھنس کر گاؤں کے لوگ بعض اوقات ایسے کام بھی کر بیٹھتے تھے جن پر اُنہیں بعد میں پچھتانا پڑتا تھا۔ لیکن ایسی باتیں بہت کم پیش آتی تھیں۔ اور پھر یہ تو سماج کی اُلجھنوں کا قصور تھا، نہ کہ اُن کا۔

کبالا کی دُکان پہاڑ کی چوٹی کے قریب دیودار کے دو مضبوط درختوں کے سائے تلے، لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر تیار کی گئی تھی۔ اور یہ کبالا کی دُکان بھی تھی اور اس کا آبائی گھر بھی۔ مہاندر کا خوبصورت گاؤں نیچے تلیٹی میں واقع تھا۔ اور جب ہوا دیودار کے درختوں میں گزرتی ہوئی گیت گاتی اور سُورج دیوتا اپنے سُنہری رتھ پر سوار ہو کر اونچے دیوداروں کی چوٹیوں کے اُوپر سے گزرتے تو نیچے تلیٹی میں گاؤں کی خوبصورت منقش چھتیں اور پرانے بودھ مندر کا منگولی بُرج شام کی سُنہری کرنوں میں جگ مگ جگ مگ کرنے لگتا۔ سُورج نکلتے ہی کبالا دُکان کے باہر ایک چھوٹے سے اخروٹ کے درخت کے نیچے آ بیٹھتا اور جوتیاں بناتے بناتے اپنی بڑی بڑی حیران آنکھوں سے دُور نیچے راستے پر گزرتی ہوئی مہ جبینوں کی طرف دیکھتا ___ جو مٹی کی گاگریں کولھوں پر رکھے یا سر اُٹھائے قطار باندھے گیت گاتی ہوئی آہستہ آہستہ چلتی جاتی تھیں۔ اور جب وُہ پگڈنڈی پر سے گزر جاتیں تب بھی وُہ اِن ہی کی طرف دیکھتا رہتا۔ اِس وقت کبالا کو ایسا محسوس ہوتا گویا اُن کے پاؤں سے چھو جانے سے راستے کی مٹی کا ہر ذرّہ کندن بن کر دمک رہا ہے۔ اِس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور اِسکے دِل کے اندھیرے میں ایک سونے کی لکیر سی کھنچ جاتی۔ اور اِس کا جی چاہتا کہ زور زور سے گائے۔ یہاں تک کہ دُور نیچے راہ چلتی ہوئی ماہ جبینوں کے پاؤں رُک جائیں۔ اور وُہ نازک اندام سرو قد نینا، گاؤں کے نمبردار کی لڑکی بھی ایک ہاتھ گاگر پر رکھے اور دُوسرے ہاتھ سے دھوتی کا پیلا آنچل سنبھالے اِس کی طرف تکنے لگ جائے

—اور..... چوٹی کے اوپر چھوٹے سے نیلے آسمان میں اڑتے ہوئے بادل یکایک تھم جائیں۔ اور اس کا پُرسوز گیت سننے کے لئے اونچے اونچے دیوداروں کے اوپر جھک جائیں — لیکن جب کبالا نے لب کھولا تو اس کے منہ سے ایک دبی سی چیخ نکل جاتی یہ کرخت اور بلند۔ جیسے سن کر آس پاس کے درختوں پر بیٹھے ہوئے نازک مزاج لگو، سنہولے اور رتگلے پر پھڑپھڑاتے ہوئے اڑ جاتے۔ اور کبالا شرمندہ ہو کر اپنے لب زور سے بھینچ لیتا۔ جیسے انہیں سوت کے ٹانکوں سے اس نے خود ہی سی دیا ہو۔

کبالا کی صورت شکل بہت اچھی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں کسی وحشی ہرن کی سی تھیں اور چہرہ بیضوی۔ اور جب وہ اخروٹ کے درخت کے نیچے زانو تہ کئے جوتے بنا رہا ہوتا۔ تو اس کا پاک اور معصوم چہرہ بالکل کسی دیوتا کی طرح معلوم ہوتا۔ صورتیں کس قدر دھوکہ دیتی ہیں۔ کبالا کو دیکھ کر کسی کو یہ گمان نہ ہو سکتا تھا کہ آج سے دو سو برس پہلے اسی موچی کے ایک بزرگ نے اس گاؤں کے ایک غریب بڈھے سادھو کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا۔ کیونکہ اسے شک تھا کہ بڈھا سادھو اس لڑکی کو ورغلا رہا تھا، جس سے کبالا کے اس بزرگ کو محبت تھی۔ گاؤں میں قتل کی واردات شاید اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اور گاؤں کے پنچوں نے بڑے غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ کسی کی جان کے بدلے دوسرے کی جان لینا ادھرم ہے۔ اس لئے انہوں نے کبالا کے بزرگ کو گاؤں سے باہر نکال دیا تھا۔ اور اعلان کر دیا تھا کہ جب تک اس خاندان کی سات پشتیں اس گناہ کا کفارہ ادا نہ کر لیں اس خاندان کے کسی فرد کو

یہ اجازت نہ ہوگی۔ کہ وُہ گاؤں کی حدود کے اندر قدم رکھ سکے۔ اِس دِن سے لیکر گاؤں کے موچی کی دُکان پہاڑ کی چوٹی کے قریب واقع تھی۔ گرمی ہو یا سردی، دھوپ ہو یا برف، چار پُشتوں سے مہنڈر کے موچی نے گاؤں میں قدم نہ رکھا تھا۔ وُہ بہت سی چیزیں کھنیتر کے گاؤں سے لے آتا تھا۔ جو مہنڈر کے کوہساروں کی دُوسری طرف ایک چھوٹی سی وادی میں واقع تھا۔ اور اب تو کھنیتر کے موچی کے خاندان سے مہنڈر کے موچی کے تعلقات اِس قدر مضبوط ہو چکے تھے کہ مہنڈر کے موچی کا خاندان بُدھ بھکشوں کی سزا کو قریباً بھول گیا تھا۔

ہاں! نوجوان کبالا کے دل میں کبھی کبھی ایک ہلکی سی ٹیس اُٹھتی۔ کیونکہ وُہ نوجوان تھا۔ اور اکیلا اور گونگا۔ اِس کے ماں باپ مر چکے تھے۔ اور کھنیتر کے موچی خاندان کے افراد اِس کے گونگا ہونے کی وجہ سے اُس سے متنفر تھے۔ آردائی اور ذی شی دونوں بہنیں اُس کا مذاق اُڑایا کرتی تھیں۔ اور اِسکے ہاتھ پاؤں کی دِلچسپ حرکات کی جن سے وُہ اپنی زبان کا کام لیا کرتا تھا، نقلیں اُتارتی تھیں اور جب اِن کے ہنسی ٹھٹھے میں اِن کے تینوں بڑے بھائی بھی شامل ہو جاتے تو گونگے کے دِل کا زخم رِس رِس کر بہنے لگتا اور وُہ چیخیں مار کر وہاں سے بھاگ جاتا۔

کبالا کا ایک دوست بھی تھا۔ اُس کا نام تھا کھنڈا۔ کبالا نے ایک دِن کھنڈا کو کھنیتر سے واپس آتے ہوئے راستے میں پڑا پایا تھا۔ وُہ بھوک سے بے تاب ہو کر چلا رہا تھا۔ اِسکی ڈائن ماں اُسے راستے ہی میں چھوڑ کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ کبالا کھنڈا کو اُٹھا کر اپنے گھر لے آیا تھا۔ اِس نے اِسے

پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا۔ اور کھنڈا بھی کبالا کو بہت چاہتا تھا۔ کئی بار جب کھنڈا کبالا کو اداس دیکھتا تو شوخ نگاہوں سے اس کی طرف تاکتا۔ اور پھر دُم ہلا کر اس طرح چیختا گویا کہہ رہا ہے۔ "گونگے بھیا! کیوں اداس ہو، میری طرف دیکھو۔ میں بھی تمہاری طرح بات چیت نہیں کر سکتا۔ لیکن کیا میں خوش نہیں ہوں۔ وہ دیکھو اس اخروٹ کی ٹہنی پر کیسی خوبصورت چڑیا بیٹھی ہے۔ او۔ وہ اڑ گئی۔ اور پھر کھنڈا چیختے چیختے کبالا کے قدموں کے گرد ناچنے لگتا۔ یہاں تک کہ کبالا کا غم دور ہو جاتا۔ اس کے چہرے پر بشاشت آجاتی اور وہ اپنے پیارے کتے کی پیٹھ کو زور سے تھپک کر اپنے پاس بٹھا لیتا۔ اس وقت اس کی نگاہیں صاف کہہ رہی ہوتیں۔ "کھنڈا بھیا! تم بہت شوخ ہو۔ شوخ اور پیارے۔ شوخی تو اداسی اور دیسٹی میں بھی ہے لیکن وہ پیاری نہیں ہیں۔ اور نینا میں شرارت نہیں۔ پر وہ بہت اچھی ہے۔ کیا تم نینا کو نہیں جانتے۔ وہ ہمارے گاؤں کے نمبردار کی لڑکی ہے اور اس دن اپنے باپ کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ نہیں جانتے؟ ذلیل کتے، چل ہٹ یہاں سے۔"

اور کھنڈا غرا کر کہتا۔ "مجھے نمبردار کی کیا پڑا ہے۔ اور میں کسی نینا وینا کو نہیں جانتا۔ اور تم مجھے اپنے پاس سے نہیں ہٹا سکتے۔ میں جنگل کے بھیڑیے کی مانند ہوں۔ مجھے کوئی معمولی ایسا ویسا کتا نہ سمجھنا، سمجھے؟"

جب کبالا نے نینا کو پہلے پہل دیکھا تو اس دن دھند چھائی ہوئی تھی۔ ایک ہلکی لطیف دھند جو دیودار کے درختوں کو اپنے سفید لبادے میں لپیٹے ہوئے

جنگل کی سبز جھاڑیوں سے لیکر چوٹی کے اُوپر آسمان میں پھیلے ہُوئے بادلوں تک چلی گئی تھی۔ ساری فضا میں صُبح کا سناٹا تھا۔ نہ ہَوا چل رہی تھی، نہ پرندوں کی بولیاں سُنائی دیتی تھیں۔ کیونکہ جب دُھند آجائے تو پرندے بھی خاموش ہو جاتے ہیں۔ اِس گُونگی دُنیا میں کبالا پہاڑی جھرنے سے نہا کر واپس آرہا تھا۔ کہ راستے میں ایک چٹان پر کھڑے ہُوئے اِس نے دُھند کی دیوی کو دیکھا۔ ہاں، یہ دُھند کی دیوی ہی تو تھی سرو قامت سر سے پاؤں تک ایک سفید ساڑی میں ملبُوس۔ اِس کا چہرہ کبالا کو ایسا معلوم ہُوا گویا شبنم کے قطروں میں دُھلا ہُوا گلاب کا پھُول دُھند کی ہلکی اور سپید لہروں میں تیر رہا ہے۔ وُہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ اور مُنہ کھولے ہُوئے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ دُھند کی دیوی نے کہا۔ ”میں راستہ بھُول گئی ہُوں۔ میں نینا ہُوں۔ مجھے گاؤں کا راستہ دکھا دو۔“

کبالا چند لمحوں کے لئے بُت کی طرح کھڑا رہا۔ پھر آہستہ سے پیچھے مُڑ گیا۔ اِس نے نینا کو ہاتھ کے اِشارے سے اپنے ساتھ آنے کو کہا۔ دُھند گہری ہو رہی تھی۔ لیکن اب وُہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اور کبالا سوچ رہا تھا۔ تم دُھند کی دیوی ہو۔ تم راستہ بھُول کر آ گئی ہو، راستہ! کبالا نینا کے پاؤں کی طرف دیکھنے لگا۔ نازک چھوٹے سے گُلابی پاؤں۔ اچھا تو وُہ چپّل کیوں نہیں پہنے ہُوئے؟ وُہ اب ایک ایسا چپّل تیار کریگا کہ دُھند کی دیوی بھی اُسے پہن کر خُوش ہو جائے۔ پتلا سا چمڑہ اور اُس پر باریک نقرئی تاروں کے پھُول، خوبصورت اور ملائم جیسے نینا کے پاؤں۔ اِس کا جی چاہا کہ وُہ دیوی کے قدموں میں اپنا

پیرد کھ دے۔ اور کہے کہ اپنے پجاری کو اِن کی پوجا کر لینے دو۔ اور پھر یکایک اُسے خیال آیا کہ وُہ تو کچھ بھی نہیں کہہ سکتا اور وُہ اِس رازِ عظیم کو اپنے دل کے انتہائی گوشوں میں چھپانے کو تیار ہو گیا۔

اب چلتے چلتے اُسے ہر لحظہ ڈر رہنے لگا کہ نینا اِس سے کوئی بات نہ پُوچھ لے۔ ایک بات، ایک لفظ۔ اور پھر وُہ جان لیگی کہ وُہ گونگا ہے۔ اور قدرت نے اُسے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا ہے۔ خاموش اور بے حس۔ شاید پیدا ہونے پر وُہ ایک بار چلّایا ہوگا۔ لیکن اب تو گویائی کی ایک رمق بھی باقی نہ تھی۔ اور اُس کا سازِ حیات بالکل بے حس بے جان اور موت کی طرح ساکن تھا۔ گاؤں کی حد کے قریب پہنچکر کبالا کھڑا ہو گیا۔ اور پھر اُس نے ہاتھ کے اِشارے سے دُھند میں لپٹے ہُوئے راستے کی طرف اِشارہ کیا۔

نینا نے ایک لمحہ کے لئے رُک کر پُوچھا۔ تم کون ہو۔ کہاں سے آئے ہو۔ مَیں نے پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔ تم کہاں رہتے ہو؟

کبالا نے پہاڑ کی چوٹی کی طرف اِشارہ کیا۔ اور پھر آنکھیں نیچی کر کے کھڑا ہو گیا۔

چند لمحوں کے بعد نینا بولی۔ "اوہ ـــــ تُم ہو کبالا؟"

کبالا دیر تک گردن جھکائے، بازو لٹکائے کھڑا رہا۔ اور جب وُہ چلنے لگی تو اُس نے اپنی بڑی بڑی وحشی ہرن کی سی آنکھوں سے نینا کی طرف دیکھا۔ وُہ کیا کہنا چاہتا تھا؟ وُہ کیا کہہ سکتا تھا؟ کاش وُہ کچھ کہہ سکتا؟

نینا آہستہ سے مُڑ گئی، سپید دُھند میں اُس کی مٹتی ہُوئی تصویر کو دیکھ کر کبالا کی

آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

جس دن بینا راستہ بھول کر کبالا کے دل میں اُتر آئی تھی، اُس دن سے کبالا کو ایسا معلوم ہونے لگا تھا جیسے زمین کے سوئے ہوئے سب سپنے جاگ اُٹھے ہیں۔ مہنڈر کے خلد زاروں میں ایک نئی اور دلکشی آ گئی ہے اور اس کی رُوح میں خُوشی اور غم کی حدیں پھیلتے پھیلتے ایک دُوسرے سے مل گئی ہیں۔ شاید اگر وُہ گُونگا نہ ہوتا تو اُس کے جذبات کی بلندی کا یہ عالم نہ ہوتا۔ اگر اس کی زبان بین سے اُسکے دل کا مُدعا کہہ سکتی تو شاید اُس کی وارفتگی کی کیفیت ہی کچھ اور ہوتی۔ لیکن اب جبکہ اس کے جذبات کے سیلِ بے کراں نے چاروں طرف قُدرت کے لگے ہُوئے آہنی بند دیکھے تو اس کی رُوح کی تڑپ اور شعریت اس کی بنائی ہُوئی چپلوں اور جُوتیوں میں منقلب ہو گئی۔

اِن دنوں اس نے چپلوں اور جُوتیوں کے ایسے ایسے نفیس اور نادر نمُونے ایجاد کیے کہ اس کی شہرت بہت جلد اطراف میں پھیل گئی۔ اور لوگ دُور دُور سے آکر اُس سے جُوتے اور چپل بنوانے لگے۔ کھنیر کے موچی نے اس سے اشاروں ہی اشاروں میں کئی بار کہا کہ اب جبکہ تمہاری دُکان چمک اُٹھی ہے، تمہیں شادی کر لینی چاہیئے۔ اور اب وُہ بغیر کسی معاوضے کے کبالا کو اروائی یا ذی شی کا رشتہ دینے کو تیار تھا۔ ذی شی اور اروائی بھی تو اب اُسے اتنا دِق نہ کرتی تھیں۔ اب اِن کی نگاہوں میں شوخی کے ساتھ احترام یا شاید کچھ اور جذبات بھی ملے ہُوئے تھے۔ شاید اب وُہ دونوں اپنی اپنی جگہ کبالا کو اپنا ہونے والا خاوند سمجھ رہی تھیں۔ اب اِنہیں کبالا کی بڑی بڑی آنکھوں

میں، دیوتاؤں کے سے چہرے میں، دِل آویز رنگت میں اور لمبے گٹھیلے جسم میں جرات، مردانگی اور خوبصورتی کے تمام لوازم دکھائی دیتے تھے۔ جس طرح تالاب میں کاغذ کی ایک ہلکی سی ناؤ ڈال دینے سے بھی لہریں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور پھر وُہ بڑھتی ہوئی، دائرے بناتی ہوئی چاروں طرف پھیل جاتی ہیں۔ اِسی طرح کبالا کی محبّت کی ناؤ نے بھی مہنڈر کی ساکن فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ اور اب یہ لہریں چاروں طرف پھیل گئی تھیں۔ کھنڈا کو اِس بات کا پتہ لگ گیا تھا اور نینا کی سہیلیوں کو۔ اور شاید گاؤں کے بعض اور افراد کو بھی۔ جب گاؤں کی دوشیزائیں نینا کو چھیڑتیں تو نینا کو کبالا پر بہت غصّہ آتا تھا، بے وقوف، گونگا، پاگل، چمار نہ جانے وُہ اِسے کیا کیا کچھ کہہ ڈالتی تھی۔ اور بچارے کبالا کو کیا پتہ تھا کہ نینا کا باپ تو ایک عرصہ ہُوا نینا کے بیاہ کا معاملہ طے کر چکا تھا۔ اِس نے نینا کو تاشی پور کے بودھ سردار سے بیاہ دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔ بڑی مشکل سے تین ہزار روپیہ پر فیصلہ ہُوا تھا۔ تاشی پور کا سردار بہت کنجوس تھا اور دو ہزار سے زیادہ دینے کا نام نہ لیتا تھا۔ تب نینا کے باپ نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ تاشی پور کے سردار سے اپنی لڑکی بیاہنے کا مطلب یہ تھا کہ وُہ اپنی چہیتی بیٹی کو جہنم میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کرے۔ ہاں، تاشی پور جہنم سے کم نہ تھا۔ اُونچے اونچے سنگلاخ پہاڑ، دُشوار گزار راستے، ہر وقت برف و باراں، تاشی پور برف کا جہنم تھا۔ وُہ یقیناً اپنی نازک اندام بیٹی کو

تاشی پور کے بودھ سردار سے نہیں بیاہے گا۔ آخر بڑی مشکل سے تین ہزار پر فیصلہ ہُوا۔

لیکن کبالا اپنی جگہ خوش تھا۔ نینا دو بار اپنے باپ کے ساتھ اُس کی دُکان پر چپلوں کا ماپ دینے آئی تھی۔ نینا کے لئے اُس نے ایسے خوبصورت چپل تیار کئے تھے، جنہیں دیکھ کر گاؤں کی دوشیزائیں رشک سے جل گئی تھیں۔ نینا کے پاؤں کو جنہیں قدرت نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا چھو کر کبالا کے دِل میں یہ خواہش آگ کی طرح بھڑک اُٹھی تھی کہ وُہ اِن دو کنول کے پھولوں کو اُٹھا کر اپنے سینے میں چھپا لے۔ نینا کے باپ نے اِس کے کام سے خوش ہو کر اُس سے وعدہ کیا تھا کہ وُہ بودھ پنچوں سے کہکر کبالا کے خاندان کی سزا کو منسوخ کرانے کی کوشش کریگا۔ اور غالباً جلد ہی کبالا کو اپنے گاؤں میں واپس آنے کی اجازت مِل جائے گی۔ اور پھر نینا کی آنکھیں بھی خوشی سے چمک اُٹھی تھیں۔ اور اُس نے نہایت ملتجیانہ انداز میں اپنے باپ سے درخواست کی تھی۔ کہ وُہ ضرور غریب کبالا کے خاندان کی سزا منسوخ کرادے۔ اِن باتوں کو یاد کر کے وُہ جوتیاں بناتے بناتے خود ہی مُسکرا پڑتا۔

ہاں وُہ بہت خوش تھا۔ وُہ دِن بھر اچھے اچھے چپل بناتا۔ کھنڈا کے ساتھ کھیلتا اور صبح و شام اخروٹ کے درخت کے تلے کھڑے ہو کر دُور نیچے گھاٹی کے سُنہری راستے پر گُزرتی ہُوئی ماہ جبینوں کی طرف دیکھتا۔ اُن میں نینا بھی ہوتی تھی۔ پیلے آنچل والی نینا۔

. . . .

اور پھر ایک دن گاؤں کے لوہار نے کبالا کو بتایا۔ کہ گاؤں کے نمبردار کی لڑکی نینا کی شادی ایک دو دن میں تاشی پور کے بدھ سردار سے ہونے والی ہے۔ شادی اونتی پور میں ہوگی۔ جو مہندر اور تاشی پور کی درمیانی حد پہ اونچے برفانی پہاڑوں کی ایک تنگنائے میں واقع تھا۔ شادی کی رسوم اونتی پور کا مقدس بدھ پجاری سرانجام دیگا۔ نینا بڑی خوش قسمت تھی۔ کہ ایک ایسے بڑے سردار سے بیاہی جانے والی تھی جو کسی طرح بھی ایک راجہ سے کم نہ تھا اور سُنا ہے لوہار نے کہا۔ "کہ نینا کے باپ نے تاشی پور کے سردار سے تین ہزار روپیہ لیا ہے۔ اب یہ مزا دینے والے بدھ بیچ کہاں سو گئے ہیں"، گاؤں کا لوہار بہت دیر تک اسی طرح کبالا سے باتیں کرتا رہا۔ اور کبالا سر جھکائے ایک چپل میں سوت کے ٹانکے لگاتا رہا۔ اور جب لوہار وہاں سے رخصت ہوگیا۔ تو نمبردار کا بھیجا ہوا ایک آدمی آگیا۔ اور اس نے کبالا سے کہا کہ نمبردار کہتا ہے کہ کبالا سے کہو کہ وہ نینا کے لئے عروسی چپل کل صبح تک تیار کردے، کیونکہ انہیں کل صبح ہی اونتی پور جانا ہے۔ پرسوں نینا کی شادی ہے۔

نینا کی شادی؟ کبالا کے دل میں پہلے تو خیال آیا کہ عروسی چپل بنانے سے انکار کردے۔ اس نمبردار کے بھیجے ہوئے آدمی کا گلا گھونٹ ڈالے۔ نمبردار کی جان لے لے۔ اور پھر اسی پہاڑ کی چوٹی سے گر کر

نیچے کی چٹان پر اپنا سر پٹخ دے۔ لیکن اِس نے بڑی مُشکل سے آخر اپنے غصّے اور نااُمیدی پر قابو پا لیا۔ اور نمبردار کے آدمی سے اِشاروں میں کہا۔ کہ وُہ نمبردار کے حُکم کی ضرور تعمیل کرے گا۔ لیکن اُس وقت اِس کے پاس نقرئی تار نہیں ہیں۔ وُہ اِنہیں کھنیتر سے لائے گا۔ اور کل صُبح تک عروسی چپّل ضرور تیار کر دیگا۔

لیکن دُوسرے دِن جب نمبردار کا آدمی چپّل لینے کے لئے آیا تو کبالا نے ہاتھ جوڑ کر اُس سے اشاروں میں کہا کہ عُروسی چپّل تیار نہیں ہے۔ وُہ کھنیتر گیا تھا۔ لیکن اُسے نقرئی تار کہیں سے نہ مِلے اور وُہ بے نیل و مرام واپس آ گیا۔ اُسے بہت افسوس تھا کہ عرُوسی چپّل کے تیار نہ ہونے سے شادی میں رُخنہ پڑتا تھا۔ لیکن وُہ کیا کرے۔ وُہ بالکل ناچار تھا۔

جب نمبردار کے آدمی نے یہ باتیں اپنے مالک سے کہیں تو وُہ بہت سیخ پا ہُوا۔ اُس نے بدبخت گُونگے کو بے نقط سُنائیں۔ کمینہ، بدمعاش، گُونگا۔ وُہ اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتا ہے کیا؟ خبیث، شیطان، کیا وُہ یہ سمجھتا ہے کہ اگر عروسی چپّل نہ ہوگی تو نینا کی شادی رُک جائے گی۔ وُہ اِس پاجی کو نینا کی شادی سے واپس آنے پر ضرور مزا چکھائے گا۔ وُہ ایسا انتظام کرے گا کہ منہڈر کے لوگ تو کیا آس پاس کے کِسی گاؤں کا کوئی آدمی بھی اِس کے ناپاک ہاتھوں کا بنا ہُوا جُوتا نہ پہنے۔ لیکن ذرا وُہ

اپنی لڑکی کی شادی سے فارغ ہو لے۔

کچھ دیر کے بعد اسی اخروٹ کے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر کبالا نے دیکھا کہ گاؤں کے لوگ اداننتی پور کو جانے والے راستے کی طرف اکٹھے ہو رہے ہیں۔ گاؤں کے نمبردار کو اس کے مبارک سفر پر روانہ کرنے کے لئے پھر کچھ عرصے کے بعد ڈھول، قرنوں، نفیریوں اور مقدّس منتروں کی آواز کے درمیان نمبردار، نینا اور اپنے عزیز و اقارب کو لیکر اداننتی پور کی جانب روانہ ہو گیا۔ کبالا دیر تک کھڑا دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ سازو سامان سے لدی ہوئی خچریں اور قافلے کے لوگ تنگ راستے سے گزرتے ہوئے اگلے موڑ پر غائب ہو گئے۔ اس کے سینے سے ایک آہ نکلی، اچھا تو یہ اس کی محبت کا انجام تھا۔ لیکن اسے اس سے بہتر انجام کی اُمید ہی کیوں ہوئی؟ وہ چُپ چاپ سر جھکائے اپنے لکڑی کے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ کھنڈا اس کے قدموں کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ کبالا نے غصّے میں آ کر اسے ایک دو ٹھوکریں لگائیں۔ لیکن غریب کھنڈا چلایا نہیں، بلکہ اپنے مالک کو اداس نگاہوں سے دیکھتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے آ گیا۔ کبالا نے کھاٹ پر بیٹھ کر اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اور کھنڈا نے اپنی تھوتھنی اس کے دونوں پاؤں

کے درمیان رکھ دی۔ پھر ایک بہت لمبے عرصہ کے بعد کبالا نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر کھنڈرا کو اُٹھا لیا۔ اور اسے گلے سے لپٹا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ غریب گونگے کا مضحکہ خیز رونا۔ لیکن اسے دیکھنے والا وہاں کوئی نہ تھا۔ ہاں اب اس کا ضمیر اسے بار بار ملامت کر رہا تھا۔ کہ اس نے نینا کے لئے عروسی چپّل کیوں نہ تیار کر دیا۔ چمڑا اس کے پاس تھا اور نقرئی تار بھی۔ یہ کیسی کمینہ حرکت تھی، آخر اس میں نینا کا کیا قصور تھا؟ اور اب کیا نینا عروسی چپّل پہنے بغیر ہی بیاہی جائے گی۔ ننگے پاؤں، کتنی شرم کی بات تھی۔ لیکن وُہ تو اب بھی اس کے لئے ایک ایسا عروسی چپّل تیار کر سکتا تھا۔ کہ جس پر کنول کے پھولوں کا دھوکا ہو۔ پھر اس نے سوچا کہ وُہ کیوں نہ ابھی عروسی چپّل تیار کرنے کے لئے بیٹھ جائے۔ وُہ راتوں رات سفر کرتا ہُوا اگلی صُبح اوانتی پور پہنچ سکتا تھا۔ اور شادی سے پہلے خود اپنے ہاتھوں سے نینا کے پاؤں میں چپّل پہنا سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے چپّل بنانے کا تہیّہ کر لیا۔ اور چمڑا صاف کرنے بیٹھ گیا۔

جب کبالا نے چپّل مکمّل کر لی۔ تو اس وقت مغرب میں شفق کی سُرخی بھی باقی نہ رہی تھی۔ چاروں طرف پہاڑوں پر سیاہ بادل

اُمڈ آئے تھے۔ اور اپنے سانس روکے ہوئے پہاڑی کے گرد حلقہ بنائے کھڑے تھے۔ تب دھیمے سے ایک انگڑائی لے کر رات کی رانی جاگ اُٹھی۔ اور اُس نے بادلوں کو اپنے گرد پاکر خوشی اور مستی سے ناچنا شروع کر دیا۔ اِس کے پازیب کی جھنکار بدھ مندر کے منگولی برج اور گاؤں کی منقش چھتوں میں لرزتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اور اِس کی کلائیوں میں پڑے ہوئے نقرئی کنگن رہ رہ کر کوندجاتے تھے۔ اِن ہی کی چمک میں گاؤں کے لوہار اور کمہار نے دیکھا کہ اوانتی پور کے پرپیچ اور دُشوار گذار راستے پر کبالا سر جھکائے اور بغل میں گٹھڑی دبائے گھنڈا کو ساتھ لیئے جا رہا ہے۔

....

اور لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اِس رات مہنڈر کی وادی میں ایک ہیبت ناک چیختا ہوا طوفان آیا۔ وُہ طوفان جس نے پہاڑ کے بڑے بڑے درختوں کو جڑ سے اُکھیڑ پھینکا۔ نمبردار کے اُونچے گھر کی منقش چھت اُڑ گئی۔ اور پُرانے بودھ مندر کا بُرج پارہ پارہ ہو گیا۔ شمالی ہوائی کے برفانی فراٹے چاروں طرف ژالہ باری کرتے گئے اور پھر ایک شدید ہولناک برفباری شروع ہوئی۔ جس نے صبح ہوتے ہی مہنڈر اور کھنیتر اور تاشی پور کے کہاروں کو برف کی ایک سفید گہری چادر سے

ڈھانپ دیا۔ اور دُوسرے دِن دوپہر کے وقت جب تاشی پور کا
بوڑھا سردار اپنی دُلہن کو لیکر تاشی پور روانہ ہُوا۔ اور برات
شہنائیاں بجاتی ہُوئی اوانتی پور کی درمیانی بلند گھاٹی میں سے
گذری تو براتیوں نے دیکھا کہ گھاٹی میں سفید برف پر دُور تک
قدموں کے نشان پڑے ہیں۔ اور ایک بڑے تناور درخت
کے نیچے ایک بدقسمت راہ گیر مرا پڑا ہے۔ اِس کا کُتا اِس کے
پاؤں میں مُنہ دیئے ہُوئے اکڑ گیا تھا۔ راہ گیر کے ہاتھ اِس کی چھاتی
پر بندھے ہُوئے تھے۔ اور وُہ اِن کی مضبُوط گرفت میں کوئی
چیز تھامے ہُوئے تھا۔ یہ ایک پتلا کاغذی چمڑے کا بنا
ہُوا عرُوسی چپّل تھا اور اِس پر چاندی کی تاروں سے کنول
کے دو خُوبصورت سفید پھُول کڑھے ہُوئے تھے۔

منگلیک

شگفتیک

ایک ایکٹ کا ڈراما

افرادِ ڈراما

۱۔ پران ۔۲۔ حمید (ڈو بیکار گریجوایٹ) ۳۔ منڈو (نوکر) وقت
دوپہر۔ مقام لاہور۔ شہر کے اندر ایک اونچے
سہ منزلہ مکان کی برساتی

پس منظر :۔ سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ اور حمید جس کی آواز سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا دم پھول گیا ہے۔ برساتی کے اندر یہ کہتے ہوئے داخل ہوتا ہے

"پران ؟ ... پران ؟ ...... کہاں ہو ؟ ...... او پران ؟"

پران :۔ میں یہاں اس برساتی میں بیٹھا ہوں، حمید ! اندر

آجاؤ..... اِس طرف کرُسی گھسیٹ کر بیٹھنے کی آواز آتی ہے۔ اور
پھر ایک لمبی سانس!)

حمید:۔ اوہ!..... عجیب سیڑھیاں ہیں۔ تمہارے مکان کی، چڑھتے جاؤ،
چڑھتے جاؤ، کبھی ختم نہ ہوں..... یہ تم تین منزل اُوپر بیٹھے
کیا کر رہے ہو؟ کوٹھوں پر چڑھنا کہاں کی شرافت ہے؟
مجھ جیسے موٹے آدمی کے لئے اِس سے زیادہ اور کیا سزا تجویز
کی جا سکتی ہے کہ اُسے تمہارے تین منزلہ مکان کی تنگ اور
اندھیری سیڑھیوں پر دِن میں ایک دو بار چڑھنے اُترنے
کو کہا جائے..... اچھی شرافت ہے!

پیمان:۔ تو اپنے گھر کی برساتی میں بیٹھنا بھی گُناہ ہے۔
..... سگریٹ پیو گے؟

حمید:۔ ذرا دم لے لوُں (ایک لمبی سانس لیکر) ایمان سے
..... تمہارے گھر کی سیڑھیاں قطب مینار کے زینہ کی طرح
لمبی اور پیچدار ہیں..... ایک گلاس پانی کے لئے کہنا۔

پیمان:۔ (ہنسکر) موٹے آدمی کو پسینہ اور غُصّہ بہت جلد آتا ہے۔
سوڈا منگاؤں؟..... منڈو..... او منڈو..... او بے
نالائق..... چھت پر آ۔

(دُور سے آواز) جی آیا۔

پیران:۔ اچھا، دیکھ، وہیں سے میری بات سُن لے، لپک کر نکڑ والی دوکان سے ایک بوتل سوڈا اور ایک پیسہ کی برف...... سُنا تُو نے؟

(دُور سے آواز) جی ابھی لایا!

پیران:۔ اچھا تو تم کیا کہہ رہے تھے، حمید؟

(حمید سگریٹ سُلگا تا ہے۔ دیاسلائی جلنے کی آواز)

حمید:۔ (سُلگاتے ہوئے) ہوں.... ہوں..... میں کہہ رہا تھا کہ تیسری چھت پر برساتی میں بیٹھ کر دُھوپ تاپنا کہاں کی شرافت ہے؟

پیران:۔ مگر اِس میں ہرج ہی کیا ہے؟

حمید:۔ ہوں..... اِس میں ہرج ہی کیا ہے؟ محلّے کی لڑکیاں، بہو، بیٹیوں کو پریشان کرتے ہو۔ اور پھر بھی تمہیں یہ پُوچھنے کی جُرات ہوتی ہے کہ اِس میں ہرج ہی کیا ہے۔ کیا یہ شریفوں کے چلن ہیں؟ جو بھلے مانس ہوتے ہیں۔ وُہ نیچے بیٹھک میں بیٹھتے ہیں، تاکہ محلّے کی تمام عورتیں اطمینان سے چھتوں پر چڑھ کر ایک دُوسرے سے بات چیت کر سکیں.....اور

اب تُم ہی بتاؤ جب سے تم چھت پہ آئے ہو، کیا محلّے کی
چھتوں پہ دو، دو فرلانگ تک بھی کوئی عورت نظر آتی ہے،
اَور پھر مجھ سے پُوچھتے ہو، اِس میں ہرج ہی کیا ہے۔ ایسے
بھائی، کیا تُم ہماری معاشرت کی الف، ب، ت، سے
بھی واقف نہیں؟
پران :۔ تو کیا ہماری معاشرت یہی کہتی ہے کہ مَرد نیچے بیٹھکوں
میں سَردی سے ٹھٹھریں، اَور عورتیں کوٹھوں پہ چڑھ کر ایک
دُوسرے کو کوسنے دے کر سارا محلّہ سر پہ اُٹھالیں۔
اب دیکھو، جب سے مَیں یہاں بیٹھا ہُوں، یہاں کتنا امن ہے
..... سکون..... سکوت...... گہری خاموشی...... اَور دُھوپ کیسی
خوشگوار ہے...... جی چاہتا ہے دِن بھر یہیں بیٹھا رہُوں۔
حمید :۔ اَور میرا جی چاہتا ہے، تمہارا مُنہ جھلس دُوں.... ہاں یاد
رکھو اگر محلّے کی معاشرت کیخلاف تمہارا چلن یہی رہا۔ تو پھر دو
چار روز ہی میں تُم پہ وُہ اتہام تراشے جائیں گے۔ اَور یہی
محلّے کی خالائیں جو اب تمہیں "کہو بیٹا کیسے ہو؟" اَور بڑا
سعادت مند لڑکا ہے۔" کہکہ ہمیشہ پچکارتی رہتی ہیں،
اُس وقت تمہارے خلاف وُہ وُہ طوفان بپا کر دیں گی۔ کہ

تمہاری زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ اور محلّے میں رہنا دوبھر... میری بات مانو، اب بھی وقت ہے، چُپکے سے نیچے بیٹھک میں چلے چلو۔

پران :۔ (ہنسکر) بھائی حمید تمہاری باتیں ہمیشہ خوشگوار ہوتی ہیں..... خوشگوار اور بے معنی..... تم یہاں آکر کیسی پُرلُطف بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔

حمید :۔ یہ سب تمہارے محلّے کی آب و ہوا کا اثر ہے۔ تم نے یہاں ناجائز شراب کشید کرنے کی بھٹی تو نہیں لگا رکھی۔

پران :۔ (ہنستا ہُوا) بیشک، بیشک، مگر کاش تُم محکمہ آبکاری کے انسپکٹر ہی ہوتے۔ نہ کہ محض ایک بے کار۔

حمید :۔ محکمہ آبکاری نہ سہی تو محکمہ بیکاری ہی سہی عمر۔ تجھے ڈھونڈ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں۔

پران :۔ پھر بھی..... اب کیا کرنے کا ارادہ ہے؟

حمید :۔ تُم اپنی کہو۔ میں تو آجکل "السٹریٹڈ ویکلی" کے معمّے حل کرتا ہُوں۔

پران :۔ اسے وُہ کب سے؟

حمید :۔ کوئی ایک ہفتے سے، بات یُوں ہُوئی۔ کہ گذشتہ اتوار کو

نیلے گنبد کے موڑ پر انار کلی کی طرف جاتے ہوئے مجھے یکایک نیر مِل گیا۔

پیران:۔ کون اکرام نیر، جو بی۔اے میں ہمارا ہم جماعت تھا۔

حمید:۔ ہاں.... ہاں.... وُہی بطخ کے چوزے جتنا بلند و بالا، تو وہ مجھے نیلے گنبد کی طرف ایک نئی ڈارک بلیو رنگ کی کار کے دروازے پر مِل گیا۔ مجھ سے ملتے ہی کہنے لگا۔ ہیلو۔ حمید بیٹا تم اِتنے دِنوں کہاں رہے؟

پیران:۔ تو تم نے اُس سے کیا کہا؟

حمید:۔ مَیں نے اُس سے کیا کہا؟ مَیں اُس سے کیا نہ کہہ سکتا تھا؟ تم ہی ذرا خیال کرو۔ کہ تمھارا ایک ہم جماعت، جسے کالج کی زندگی میں تم نے "ننھے مینڈک" سے زیادہ اچھا لقب کبھی نہ دیا ہو۔ تمہیں اگر دو برس کے بعد یکایک ایک ڈارک بلیو کار......

پیران:۔ (قطع کلام کر کے) بس، بس، مَیں سمجھ گیا۔ (ہنستا ہے)

حمید:۔ اچھا تو سمجھ گئے تم کہ مَیں نے اُس سے کیا کہا ہوگا؟

پیران:۔ (ہنستے ہوئے) ہاں ہاں، مگر یار یہ تو بتاؤ کہ پھر اُس نے کیا کہا؟

حمید :- وہ کہنے لگا وہ آج کل جبل پور میں اکزیکٹو آفیسر ہے، کنٹونمنٹ میں ساڑھے تین سو روپے تنخواہ لیتا ہے۔ اور فرسٹ گریڈ میں ہے۔ یہاں وہ اور اس کی بیوی کرسمس کے دنوں میں نمائش دیکھنے آئے ہیں۔ نمائش کا تو ایک بہانہ ہے۔ ورنہ میرے خیال میں وہ تو محض اپنی بیوی اور اپنی ڈاج کار کی نمائش کرنے یہاں آیا ہے۔ خاص کر اپنے دوستوں کو چڑانے کے لئے اور..........

پران :- (قطع کلام کر کے) معاف کرنا مگر تم نے اس کی بیوی دیکھی۔

حمید :- ارے یار اس نے اس وقت تک میری خلاصی نہ کی جب تک اس نے مجھ سے یہ وعدہ نہ لے لیا۔ کہ میں دوسرے دن شام کے پانچ بجے فلیٹ (۵) گاف روڈ پر اس کے ہاں چائے پیوں گا۔ ناچار دوسرے دن مجھے اس کے ہاں جانا پڑا۔ وہاں پتہ لگا۔ کہ آنجناب نے گاف روڈ والی کوٹھی نئی لی ہے۔

پران :- پھر تو اس نے گن گن کر بدلے لئے ہوں گے۔

حمید :- کچھ نہ پوچھو۔ شاید کالج کے دنوں کے زخم اس کے دل میں اب تک تازہ تھے، پہلے تو کہنے لگا، بھئی حمید کیا کروں۔ تمہاری طرح عیش تو نہیں کرتا۔ مزدور آدمی ہوں، سارا

دِن دفتر میں کام کرتا ہُوں۔ یا پھر دَورے پر رہتا ہُوں۔ ساڑھے تیس تنخواہ ملتی ہے۔ امیر طبیعت بیوی ہے۔ بڑی مُشکل سے گذارا ہوتا ہے عجیب مصیبت ہے۔

(سیڑھیوں پر ہلکے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ حمید خاموش ہو جاتا ہے۔)

مُنڈو :۔ (پتلی آواز میں) بابُو جی، سوڈا برف نہیں ملی۔ دُوکاندار بولا، آج کل سردیوں میں کون پاگل برف مانگتا ہے۔ میں نے کہا، بابُو جی برف مانگتے ہیں۔ اُس نے نہیں دی۔ میں نے بہتیرا......

(حمید زور سے قہقہہ لگاتا ہے)

پیران :۔ جاؤ۔ جاؤ۔ نیچے کام کرو۔ بے وقوف کہیں کا۔

(سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ، آواز آہستہ آہستہ ہلکی ہوتی جا رہی ہے اور پھر بالکل کم ہو جاتی ہے۔)

پیران :۔ ہاں، تو پھر اکرام نے تمہیں اپنی بیوی دکھائی ہو گی۔

حمید :۔ (وقفے کے بعد گلاس کو میز پر رکھتا ہے) بیوی؟ ارے میاں اِس کمبخت نے تو اپنے گھر کا ایک ایک کونا مجھے دکھایا۔ یہ سٹڈی روم ہے، یہ ڈرائینگ روم ہے، یہ ڈائینگ ہال پردے پسند کرو، ولائتی صوفوں پر شاعرانہ مبالغہ آرائی کرو۔ کرسیوں، چائنا

گھر کے کُتّے تک کے ساتھ عزّت سے پیش آؤ۔ تصاویر، میز پوش، گلدان، غالیچے، ریڈیو سیٹ، اِس کے بعد یہ ہیں بیگم اکرام، مجھ سے اِس طرح باتیں کرنے لگیں جیسے میں نے زندگی بھر کبھی کوئی خوبصورت عورت نہیں دیکھی۔ اور اکرام صاحب پاس کھڑے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ سمجھتے ہوں گے کہ دُنیا میں اگر کسی کو حسین بیوی ملی تو انہیں، صرف اِنہیں، اور بچارے دُوسرے لوگ تو محض اُونٹنیوں سے نکاح کرتے ہیں۔

پران:۔ تو پھر؟

حمید:۔ تو اب میں اُسی دن سے معمّے حل کرتا ہُوں۔

پران:۔ (ہنستے ہُوئے) اچھی سزا ملی تمہیں۔

حمید:۔ (جواب میں ہنستے ہُوئے) پران، کچھ عجب چکّر ہے زندگی کا۔ میں سوچتا ہُوں اِس ننّھے مینڈک کو مُلازمت کیسے مِل گئی؟ سوچتا ہُوں۔ کمبخت نے کوئی فریب کیا ہوگا۔

پران:۔ گوبند کی طرح؟

حمید:۔ کون گوبند؟

پران:۔ ارے وُہی تو۔ موٹے موٹے پھُولے ہُوئے گالوں والا، جو کالج میں لٹریری کلب کا جونیئر وائیس پریذیڈنٹ ہوا کرتا تھا۔

حمید:- ہاں ہاں، یاد آگیا۔ مگر اُس کے متعلق کیا سُنا تُم نے؟

پران:- اچھا، تو کیا تمہیں پتہ نہیں؟ جناب وُہ بمبئی گیا، کسی فلم کمپنی میں مُلازمت حاصل کرنے کے لئے۔ یہ تو تُم جانتے ہی ہو کہ وُہ تھوڑا بہت گا لیتا تھا۔ بس جناب، وہاں ایک دو مہینے کی سر توڑ کوشش کے بعد وُہ آخر ایک گھٹیا قِسم کی فلِم کمپنی میں نوکر رکھ لیا گیا۔ اِس ...... اُس کمپنی کا نام مجھے اِس وقت یاد نہیں رہا۔ ہاں تو وہاں جناب کی ایک فلِم ایکٹرس سے شناسائی ہو گئی۔

حمید:- ارے!

پران:- آگے تو سُنو۔ تو جناب بس ایک دن آپ اُس کے سارے زیور لے بھاگے۔ ست لڑے ہار اور کنگن اور کڑے اور بازو بند اور گلوبند۔ اور نہ جانے کیا کیا۔

حمید:- آخر پکڑا گیا؟

پران:- ہاں، ناسک میں پکڑے گئے ...... ڈھائی سال کی سزا بھی ہو گئی۔

حمید:- ڈھائی سال تو زیادہ نہیں ...... اور پھر زیور بھی بہت ہونگے۔

پران:- نہیں۔ وُہ تو سب پیتل کے نِکلے۔ مُلمع شُدہ ...... بچارا غریب گوبند!

حمید:- مگر وہ فلم ایکٹرس کیا ہوئی۔ مجھے تو بہت سمجھدار عورت معلوم ہوتی ہے۔ اگر تم اس سے شادی......

پیران:- (قطع کلام کر کے) شاید تمہارا دِل للچا گیا ہے۔ ارے میاں، اس کی کئی بار شادی ہو چکی ہے۔ اس سے پہلے وہ دس ۱۰ مردوں کو طلاق دے چکی ہے۔

حمید:- اب گیارھواں کون ہے؟

پیران:- ایک فلمی رسالے کا ایڈیٹر تھا۔ بھلا سا نام ہے، ابو ظفر کہ کیا؟......

حمید:- فلم ایکٹرسوں کے متعلق تمہاری واقفیت خوب ہے۔

پیران:- اور کیا! اپنا اپنا شوق ہے۔ تمہیں آجکل السٹریٹڈ ویکلی کے معمّے حل کرنے کا شوق چرایا ہے۔ میں فلم ایکٹرسوں کے متعلق معلومات جمع کرتا رہتا ہوں۔

حمید:- ابو ظفر؟...... ابو ظفر...... ارے یہ کہیں وہی ابو ظفر تو نہیں جو چند سال پہلے ہمارے کالج کے رسالے کا ایڈیٹر تھا۔ اور جس کی ایک آنکھ کانی تھی۔ اور جو مِس ادشا رانی پر اپنی آنکھ رکھتا تھا۔

پیران:- کونسی آنکھ کانی؟

حمیدہ :- (ہنستے ہوئے) نہیں...... دوسری!

پیران :- پھر اس کا کیا ہوا؟

حمیدہ :- کس کا؟ ...... اُس کی کانی آنکھ کا؟

پیران :- نہیں۔ میرا مطلب ہے، اوشا کا؟

حمیدہ :- وہ، سنا ہے، آکسفورڈ چلی گئی ہے۔ وہاں اُس نے ایک اینگلو انڈین سے شادی کر لی ہے...... ارے، وہ کیا ہے؟

پیران :- کیا ہے؟ ..... پتنگ؟

حمیدہ :- نہیں..... ایک لڑکی!

پیران :- آسمان میں اُڑتی ہوئی؟

حمیدہ :- (آہستہ سے) نہیں، بیوقوف، وہ دیکھ سامنے مکان کی کھڑکی میں۔

پیران :- (لبوں پہ انگلی رکھ کر) ششش۔ ش، ش (سرگوشیانہ انداز میں) کرسی ذرا اِدھر کھینچ لو۔ (کرسی گھسیٹنے کی ہلکی سی آواز آتی ہے) یوں سامنے بیٹھے رہے تو تمہیں دیکھ کر بھاگ جائے گی۔

حمیدہ :- ایمان سے.... بہت خوبصورت ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا تمہارے محلّے میں خوبصورت عورتیں بھی ہوتی ہیں........ بس بالکل مورت معلوم ہوتی ہے۔ اِس سیاہ جیکٹ اور آسمانی

دوپٹے میں وہ بالکل پری معلوم ہوتی ہے۔ پران، یہ ہے کون؟

پران :۔ یہ کملا ہے۔

حمید :۔ ششش۔ شِ، شِ۔ آہستہ کہو، مبادا وہ سن پائے۔

پران :۔ یہ کملا ہے! ...... میں اس سے بے اندازہ محبت کرتا ہوں۔ میں کیا، محلّے کے سبھی لڑکے اس سے بے اندازہ محبت کرتے ہیں۔

حمید :۔ اس کی نگاہوں میں ایک عجیب چمک ہے۔ کانوں میں ہلتے ہوئے آویزے کندن کی طرح دمک رہے ہیں صندلی کلائیوں میں پہنی ہوئی چوڑیاں سورج کی شعاعوں کے عکس سے شعلے بن گئی ہیں۔ ایمان سے ......

پران :۔ آؤ، نیچے چلیں، یہاں دھوپ اب تیز ہو گئی ہے۔

حمید :۔ دھوپ؟ یہاں دھوپ کتنی خوشگوار ہے۔ جی چاہتا ہے سارا دن یہیں بیٹھے رہیں۔

پران :۔ (جیسے کسی سبق کو دہرا رہا ہو) ..... جو شریف لوگ ہوتے ہیں۔ وہ نیچے بیٹھک میں بیٹھتے ہیں، تاکہ محلّے کی عورتیں اطمینان سے چھتوں پر ....

حمید :۔ پران! تمہیں نقل اُتارنے کی بہت بُری عادت ہے۔

پران :۔ (اُسی لہجے میں) تو کیا تم ہماری معاشرت کی الف،

ب، ت، سے بھی واقف نہیں ؟

حمیدہ :- پران !

پران :- حمیدہ !

(دونوں ہنس دیتے ہیں)

حمیدہ :- ایلو، وہ چلی گئی۔ آنکھ جھپکتے ہی اوجھل ہوگئی۔ اور یہ سب تمھارا قصور ہے، وہ بیچاری سمجھتی ہوگی۔ کہ ہم دونوں شاید اُس پر ہنس رہے ہیں۔

پران :- گھبراؤ نہیں، وہ پھر آئے گی۔

حمیدہ :- کیوں ؟ کیا اُسے بھی تم سے محبت ہے۔

پران :- نہیں تو، مگر وہ آج بہت مسرور ہے۔ اور وہ اپنی خوشی کو چھپانا نہیں چاہتی۔ وہ چاہتی ہے کہ کوئی اس کے دل کی خوشی کو دیکھ لے۔ اُسکے جاں سوز حسن کا نظارہ کر لے۔ اس کی دلفریب مسکراہٹ کی بہار لوٹ لے۔ جلد ہی اس کی شادی ہونے والی ہے، بس کوئی پندرہ بیس دن ہیں، کل رات سے ان کے گھر میں ڈھولک بجنی شروع ہوگئی ہے۔ گیت گائے جا رہے ہیں۔ مٹھائی بانٹی جا رہی ہے۔ محلّے کی خالائیں دن رات شادی

کی رسموں پر جھگڑتی رہتی ہیں۔ محلّے کی بہو بیٹیاں مکلّف لباس زیب تن کئے ہنستی ہوئی، ایک دوسرے کو چھیڑتی ہوئی اٹھلاتی پھرتی ہیں۔ بیچاری غریب عورتیں۔ یہی دو چار دن ان کے ہنسنے بولنے کے ہوتے ہیں۔ انہی دو چار دنوں میں وہ اپنی سہیلیوں سے اچھی طرح مل سکتی ہیں۔ کوئی شادی یا پھر کوئی موت...... ورنہ اُن کی تمام زندگی تو بس گھر کے ڈربوں میں بند رہ کر گزر جاتی ہے۔

حمید :- کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔ کوئی کام کی بات کہو۔ ہاں... مگر یہ تو بتاؤ بھائی جان۔ جب تمہیں کملا سے بے اندازہ محبّت تھی تو پھر یہ محبت شادی کا باعث کیوں نہ ہوئی؟

پران :- شادی! کیا بچّوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ تم بھی بالکل گدھے ہو۔ ارے میاں، شادی اور چیز ہے، محبّت اور چیز ہے۔ اور پھر ہمارے ہاں تو شادی کے لئے محبّت ایک بالکل غیر ضروری امر ہے۔ ہندوستان میں بھی بھائی حمید محبّت ایسی فرسودہ چیز کو کون پوچھتا ہے۔ یہاں تو یہ پوچھا جاتا ہے کہ لڑکی کا باپ کیا لیتا ہے، کتنا امیر ہے، جہیز میں کیا دیگا؟ اور کئی درجنوں تکلیف دہ باتیں۔ میں نے کوشش تو بہت کی، لیکن اِن باتوں کے چکّر میں پڑ کر ہماری محبّت کا گلا ہی گھونٹ ڈالا گیا۔ اور پھر ایک اور بات بھی تھی۔ میں شاید اِن تمام دشواریوں پر

قابو پا لیتا۔ اگر......

حمید :۔ اگر؟

پران :۔ اگر کملا کو مجھ سے محبت ہوتی.... اگر کملا کسی اور سے محبت نہ کرتی۔

حمید :۔ ایمان سے.......!

پران :۔ ہاں..... کملا کو جگدیش سے محبت ہے، وہ ہمارے محلے ہی میں رہتا ہے۔ اور سچ پوچھو تو وہ ہے بھی اس کی محبت کے لائق۔ میری طرح نہیں۔ کہ چھچھوندر کی طرح شکل ہو اور بانس کی طرح قد۔ وہ میانے قد کا نوجوان ہے۔ چوڑی چھاتی، گندمی رنگ، خلجبوت آنکھیں..... اور کملا تو اسے پوجتی ہے۔ بی۔ اے۔ میں پڑھتا ہے۔ باپ بلدیہ میں نوکر ہے، تین سو کے قریب تنخواہ لیتا ہے...... میں نے کئی بار کملا اور جگدیش کو ایک دوسرے کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھا ہے۔ اور یوں تو یہ قصہ محلے کی سب عورتیں اچھی طرح جانتی ہیں۔ ایک دفعہ بڑا شور مچا تھا۔ کملا کے باپ نے جگدیش کے باپ سے ملنا چھوڑ دیا۔ اور کملا کی ماں اور جگدیش کی ماں ایک دوسرے سے روٹھ گئیں۔ اور بات صرف اتنی ہوئی تھی۔ کہ ایک دفعہ محلے کی ایک بوڑھی خالہ نے جگدیش اور کملا کو گھر کی سیڑھیوں پر ہنستے اور سرگوشیاں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا..... بوڑھی خالہ نے

وہ طوفان بپا کیا۔۔۔ وہ طوفان بپا کیا کہ۔۔۔۔۔

حمید:۔ اچھا تو گویا اب کملا اور جگدیش کی شادی ہو گی۔

پیران:۔ ارے۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ میاں۔۔۔۔۔ تم بات بھی تو سنو۔

حمید:۔ تو کیا کملا۔۔۔۔۔؟

پیران:۔ (قطع کلام کر کے) ہاں میں کہتا ہوں کہ کملا کی شادی جگدیش سے نہیں ہو گی۔ اس کی شادی کے لئے بہت دیر تک دونوں گھروں میں گفتگو ہوتی رہی۔ آہستہ آہستہ عورتیں بات پکی کرتی رہیں۔ اور دونوں گھروں میں پھر سے پہلے اور اچھے تعلقات کا سلسلہ بندھ گیا اور پھر اس بات کا چرچا سب محلے میں ہو گیا بوڑھی خالائیں ناک پر انگلی رکھ کر بڑے چاؤ سے اس ہونے والے بیاہ کا ذکر کرتی تھیں۔ "ہوئے آگ لگے اس زمانے کو شرم نہ آیا۔۔۔ جب ہمارا بیاہ ہوا تھا۔۔۔۔۔ اور اس قسم کی بہت سی باتیں۔ اب کملا اور جگدیش بہت خوش تھے چنانچہ اب کملا بہت کم جگدیش کے سامنے آتی تھی۔ اور اگر کبھی جگدیش کو نظر بھی آجاتی تو مسکرا کر اور بدن چرا کر فوراً وہاں سے بھاگ جاتی۔

حمید:۔ ہاں ہاں۔ پھر کیا ہوا؟

پران :- سنو تو سہی۔ اِسی دوران میں ایک ایسی بات ہوئی جس نے سب معاملہ چوپٹ کر دیا!

حمید :- وہ کیا؟

پران :- جگدیش منگلیک نکلا۔

حمید :- منگلیک؟

پران :- ہاں ہاں، منگلیک!

حمید :- منگلیک؟ کیا کسی بیماری کا نام ہے؟

پران :- (ہنستے ہوئے) جوتشیوں اور رمالوں کی اصطلاح میں منگلیک اُن لڑکے لڑکیوں کو کہتے ہیں جو منگل کے دِن پیدا ہوئے

حمید: تو پھر اِس سے کیا ہوتا ہے۔ کیا منگل کے روز پیدا ہونا گناہ ہے؟

پران :- نہیں۔ لیکن جب محلّے کے بُوڑھے جوتشی نے دونوں کی جنم پتریاں دیکھیں تو اُس نے سر ہلا کر کہا لڑکا منگلیک ہے۔ اِسلئے یہ شادی نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ کملا منگلیک نہ تھی۔

حمید :- مگر کیا شادی کے لئے یہ ضروری ہے کہ لڑکا اور لڑکی دونوں ایک ہی دِن پیدا ہوئے ہوں؟

سب کے لئے تو ضروری نہیں۔ لیکن جو لڑکا منگلیک ہو۔ وہ

کسی ایسی ہی لڑکی سے شادی کر سکتا ہے جو اِس کی طرح منگل کے روز پیدا ہوئی ہو ورنہ نقصان کا اندیشہ رہتا ہے۔ اگر ایک لڑکی جو خود منگلیک نہیں، ایک ایسے مرد سے بیاہی جاتی ہے جو منگلیک ہے تو ایسی صورت میں اِن کا بیاہ بہت بُرے نتائج پیدا کرتا ہے۔ یا تو وُہ عورت جلد مر جاتی ہے یا اِس کے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔ یا اُسے اور کسی طرح کی رُوحانی یا جسمانی تکلیف پہنچتی ہے۔ اور یہی حال اُن مردوں کا ہوتا ہے جو خود منگلیک نہ ہوں۔ اور کسی منگلیک عورت سے بیاہ کر لیں۔ خود ہمارے خاندان میں ایک ایسا واقعہ ہو چکا ہے۔ میرے ماموں جان نے ایک منگلیک عورت سے بیاہ کر لیا تھا۔ اور وُہ خود منگلیک نہ تھے۔ شادی کے پُورے گیارہ ماہ بعد وُہ مر گئے۔

حمید :۔ منگل کے روز؟

پران :۔ نہیں، دِن تو مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں۔

حمید :۔ اچھّا؟

پران :۔ ہاں، اِس لئے اب جگدیش کی شادی کملا سے نہ ہو گی۔ کملا کی سگائی اب ایک اور لڑکے سے ہو گئی ہے۔ نام ہے شاید شیام سُندر۔ وُہ لائل پور کا رہنے والا ہے۔ گو شکل و شباہت

سے افریقہ کا باشندہ معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اِسے دیکھا ہے۔
یہاں بی۔ اے۔ میں پڑھتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی سی آنکھیں، باہر نکلے
ہُوئے کان، بالکل بندر معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ اور اب جگدیش اور
کملا کے گھر والوں کی آپس میں بول چال اور مُلاقات بالکل بند ہے۔ اور
حمید:۔ شش۔ شش۔۔۔۔۔۔ وُہ کھڑکی میں آگئی ہے۔۔۔۔ بخدا
(کس قدر حسین ہے۔ لبوں پر کیسی دِلفریب مُسکراہٹ ہے)۔۔۔۔
یہ کھڑکی سے نیچے جُھک کر کیسے دیکھ رہی ہے۔
پیران:۔ (آہستہ سے) ٹھہرو، میں جھروکے میں سے دیکھتا ہوں۔۔۔۔
گلی تو بالکل خالی ہے۔
حمید:۔ یہ اِس کے دائیں بازو میں کیا بندھا ہے؟
پیران:۔۔۔۔۔۔۔ یہ چاندی کے "کلیرے" ہیں۔ جب نوجوان لڑکیوں
کی شادی کے دِن قریب ہوں تو یہ کلیرے اِنہیں پہنائے جاتے ہیں۔
حمید:۔ مُسکرا رہی ہے۔۔۔۔۔۔۔ بیچارا جگدیش!
پیران:۔ حمید، عورت کی محبّت کا اعتبار کیا!
حمید:۔ مُسکرا رہی ہے۔۔۔۔ بازو میں بندھے ہُوئے کلیرے اِسکی
خفیف سی حرکت سے ہوا میں جھُومنے لگتے ہیں۔ اور اُن سے کیسی عجیب
میٹھی، سُریلی سی آواز پیدا ہو رہی ہے۔ یہ جُھک کر کیسے

دیکھ رہی ہے۔ پران، ذرا جھروکے میں سے دیکھنا، نیچے کون ہے۔

پران :۔ کوئی نہیں ..... گلی تو بالکل خالی ہے۔

حمید :۔ (یکایک کرسی سے اُچھل کر اُونچی آواز میں) میرے خدا ... یہ کیا ہوگیا؟

پران :۔ کیا؟

(نیچے گلی میں سے آواز جیسے کسی نے اناج کی بوری چھت سے فرش پر پھینک دی ہو۔ ایک ہیبت ناک چیخ، پران چلّا اُٹھتا ہے۔ "کملا نے کھڑکی سے چھلانگ ..... ہائے ..... ہائے ..... پران کرسی پر سے بے تحاشا اُٹھ کر جھروکے کی طرف بھاگتا ہے شیشے کا گلاس، گھڑی اور کتابیں زمین پر آ رہتی ہیں۔ (ان چیزوں کی مختلف آوازیں) حمید خوف زدہ لہجے میں۔ "میرے اللہ" اور پھر پران! .... جھروکے کی طرف مت جاؤ۔" نیچے شور بلند ہوتا جا رہا ہے۔ چیخیں، عورتوں کے رونے کی آوازیں۔ "پولیس"۔ "پولیس"۔ لوگوں کے اِدھر اُدھر دوڑنے کی آوازیں۔ "کیا ہوا، کیا ہوا؟" "کملا! کملا!! کملا!!!" بہت سے قدموں کی چاپ ..... لوگو، میں

مر گئی، میں لُٹ گئی۔" "کیا ہُوا؟" "قدموں کی چاپ" "سامنے سے ہٹ جاؤ!"۔۔۔۔ یہ شور ڈرامے کے ختم ہونے تک جاری رہتا ہے اور بتدریج مدھم ہو جاتا ہے۔)

حمید :۔ (خوف زدہ لہجہ میں) یہ کیا ہو گیا، پیران۔۔۔۔۔اُف، میرا تو کلیجہ مُنہ کو آ رہا ہے۔

پیران :۔ ظالم کملا۔۔۔۔۔۔۔وُہ جگدیش ہے، وُہ بھیڑ کو چیرتا ہُوا آ رہا ہے (اُس کے خُوبصورت بال ماتھے پر بکھرے ہُوئے ہیں۔ اُس کی آنکھوں سے آنسُو جاری ہیں۔۔۔۔۔۔۔

حمید :۔ مجھ سے یہ منظر دیکھا نہیں جاتا۔۔۔۔پیران تم بھی اِدھر آ جاؤ۔

پیران :۔ (مسحور اور درد ناک آواز میں)۔۔۔۔۔۔۔کملا کی چھاتی سے خُون کے فوّارے نکل رہے ہیں۔ اور گلی کا فرش سُرخ ہوتا جا رہا ہے۔۔۔۔۔۔جگدیش رو رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔ سُرخ سُرخ خُون میں چاندی کے کلیرے نہا رہے ہیں۔ جگدیش نے اُسے اپنی گود میں لے رکھا ہے۔

حمید :۔ میرے اللہ۔۔۔۔میرے اللہ۔۔۔۔پیران، جھروکے سے ہٹ جاؤ۔

پیران :۔ کملا کی آنکھیں جگدیش کے چہرے پر جم گئی ہیں۔ جگدیش

پتھر کا بُت بنا گلی کے فرش پر بیٹھا ہے۔۔۔۔۔۔۔اُن آنکھوں
کی چمک کم ہوتی جا رہی ہے۔

حمید :- پران! کملا کے مُنہ سے خون اُبل رہا ہے۔۔۔۔۔۔وہ آنکھیں
کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔۔۔۔۔۔۔کیا اِن کی حسرت اب تک نہ مٹی؟
ایک آخری حرکت کے ساتھ کملا کا سر جگدیش کے سینے
پر لگ گیا۔ ہائے۔۔۔۔۔۔۔ہائے۔۔۔۔۔۔ظالم کملا۔۔۔۔۔۔
پولیس آ رہی ہے۔۔۔۔۔۔۔

(پران آہستہ سے جھروکے کی کھڑکی سے ہٹ کر واپس کُرسی پر
گِر جاتا ہے۔ کھڑکی کے ایک پٹ بند ہونے کی آواز،
کُرسی پر گِرنے کی آواز، نیچے شور۔۔۔۔۔۔)

حمید :- (آہستہ مضطرب لہجہ میں) پران!۔۔۔۔پران! یہ
کیسے ہو گیا۔۔۔۔۔۔۔ایک چُٹکی میں۔۔۔۔۔۔۔۔وہ حُسن کی
مُورت ایک لمحہ میں خاک میں مِل گئی۔۔۔۔۔۔۔وہ ابھی ابھی
کھڑکی میں کھڑی تھی۔

پران :- (دردناک لہجہ میں) ہاں!

حمید :- اُس نے سیاہ رنگ کی ریشمی جیکٹ پہن رکھی تھی،
اُس کے سر پہ آسمانی رنگ کا دوپٹہ تھا۔ (تیز لہجہ میں) اُس

کے کانوں میں چمکتے ہوئے آویزے تھے۔ اس کے بازو پر نقرئی کلیرے بج رہے تھے.......

پیران:۔ (اُسی دردناک آواز میں) ہاں!

حمید:۔ (مضطرب آواز میں) میرے خدا، مگر میں نے خود دیکھا کہ اس کے چہرے پر خوشی کا نور تھا، اس کی آنکھوں میں مسرت کی چمک، اس کے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ۔

پیران:(آہستہ سے) ہاں، حمید، وہ اپنے محبوب سے ملنے جا رہی تھی؛